نیو تاج آفس، پوسٹ بکس نمبر ۱۷۴۹، دہلی

اسی مصنّف کی دوسری تصانیف

نظم

بت کدہ (غزلوں کا مجموعہ)
فریاد (تقسیمِ وطن کے متعلق نظمیں اور گیت)
دستک (مجموعۂ کلام)
للکار (دنیا کے نمائندہ انقلابی شاعروں کی نظموں کے منظوم تراجم ان کے سوانح حیات کیساتھ)
آہٹیں (مجموعۂ کلام)
قاشیں (قطعات کا مجموعہ)
آیاتِ جنوں (مجموعۂ کلام)
پھوار (غزلوں کا مجموعہ)
سنگم (نظموں کا مجموعہ)
میرا کلام منتخب (اپنے کلام کا انتخاب)
میرا کلام نو بنو (اپنا تازہ ترین کلام)
دو آتشہ (حافظ شیرازی کے منتخب اشعار کا قطعات کی شکل میں ترجمہ)

نثر

ڈارلنگ (طبع زاد کہانیوں کا مجموعہ)
راکھ تلے (غیر ملکی افسانہ نگاروں کے شاہکار ہندوستانی لباس میں)
مالوا (میکسم گورکی کے ناولٹ کا ترجمہ)
سُرخ حاشئے حصّہ اوّل و دوم (اُردو ادیبوں کے لطائف)
مطالعے (مضامین کا مجموعہ)
شام نگر میں سنیما آیا (بچوں کیلئے ایک کہانی)
چینی بلبل (بچوں کیلئے ایک کہانی)
سمندری شہزادی (بچوں کیلئے ایک کہانی)

سرقہ اور توارد ہماری شاعری کی دو اصطلاحیں ہیں ۔ دونوں عربی کے الفاظ ہیں اور لغوی اعتبار سے دونوں کے معنی میں فرق یہ ہے۔ کہ سرقہ چوری یا دزدی کو کہا جاتا ہے اور توارد باہم ایک جگہ اترنے کے لئے یعنی شاعروں کے جزوی یا کلی طور پر ایک ہی مضمون کو نظم کرنے کے واسطے استعمال کیا جاتا ہے ۔ گویا سرقہ کیا جاتا ہے اور توارد ہو جاتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں اسے یوں کہئے کہ شاعر پہلے سے کہے ہوئے شعر سے خود استفادہ کرے تو اسے سرقہ لیکن جب یہ استفادہ خود بخود ہو جائے تو اسے توارد کہا جاتا ہے ۔ لیکن لغوی معنی کے اس تفاوت کے باوجود عملی طور پر دنیائے شعر میں ان میں چنداں فرق نہیں ہے

اگر کچھ فرق ہے تو صرف لب و لہجہ کا۔

سرقے کو بالعموم ہمارے یہاں بہت مذموم خیال کیا جاتا ہے۔
بعض شاعروں نے تو اپنے شعروں میں بھی اس کی مذمت کی ہے جیسے

مت باندھیوا ے مصحفیؔ مضمون کسی کا
ہے ننگِ خلائق وہ جو شاعر ہو سخن چور
(مصحفیؔ)

مضموں کا چور ہوتا ہے رُسوا جہان میں
چکھتی خراب کرتی ہے مالِ حرام کی
(آتشؔ)

دُزدِ سخن سے معنیٔ رنگیں کو کیا خطر
مہندی لگائے گا کوئی کیوں کر لگی ہوئی
(امیرؔ مینائی)

سرقہ نہاں رہے گا نہ اہلِ نظر سے جوشؔ
چوری کا مال گھر میں چھپایا نہ جائے گا
(جوشؔ ملسیانی)

حالانکہ دُنیا کا ہر بڑے سے بڑا شاعر سرقہ کے الزام سے
متہم ہو چکا ہے لیکن توارد کو شاعرانہ اتحادِ طبع کی مجبوری پر محمول کرنے

کی وجہ سے جائز خیال کر لیا جاتا ہے اور توارد کے ارکان کی عام طور پر یہ صورت بھی جاتی ہے کہ ایک شاعر کو شعر کہتے وقت بعض صورتوں میں تو یہ علم ہی نہیں ہوتا اور بعض حالات میں یہ یاد نہیں رہتا کہ اسی مضمون اور خیال کو کم و بیش اسی ڈھنگ سے کوئی دوسرا شاعر نظم کر چکا ہے اور توارد کے جواز میں بالعموم یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ بے شمار شاعر مختلف مقامات سے در اصل ایک ہی ہدف پر اپنے تیر پھینک رہے ہیں اور کوئی سے بھی دو تیر ایک نقطے پر متحد ہو سکتے ہیں۔ علامہ تفتازانی نے بھی اس سلسلے میں کم و بیش اسی قسم کی بات کہی ہے کہ خامۂ معنی نگار اندھیرے میں تیر مارتا ہے۔ اسے کیا خبر کہ مرغِ آزاد ہے یا طائرِ پر بستہ۔

بعض شعرا نے تو شاعری میں توارد کو ناگزیر خیال کیا ہے۔ جیسے ابو طالب کلیم کہتا ہے ؎

منم کلیم بہ طورِ بلندیٔ ہمت
که استفادۂ معنی جز از خدا نکنم

بہ خوانِ فیضِ الٰہی چو دست رس دارم
نظر بہ کاسۂ دریوزۂ گدا نکنم

ولے علاج توارد نمی توانم کرد
مگر زباں بہ سخن گفتن آشنا نکنم

لیکن چشمِ انصاف سے دیکھا جائے تو توارد بھی سرقہ ہی کی مہذب شکل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سرقہ اور توارد میں حدِ فاصل قائم کرنا بہت

دشوار ہے۔ مذاقِ سلیم کو معیار بنا کر اگرچہ ان میں امتیاز پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن مذاقِ سلیم کا اپنا معیار بھی تو بجائے خود غیر مبہم نہیں ہے۔ کیونکہ مذاقِ سلیم بہرحال ایک انفرادی ذہنی عمل ہے اور مختلف اعلیٰ درجے کے شاعرانہ مزاجوں میں بھی اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے۔

غزل میں مصرعوں کا عموماً لڑ جانا تو خیر اس لئے توارد کی ذیل میں آ سکتا ہے کہ غزل کے اسلوب کے کچھ بندھے ٹکے سانچے مقرر ہیں اور ان سانچوں میں جب مختلف شاعر اپنے تاثرات کو ڈھالتے ہیں تو اُن کے مصرعے لفظ بلفظ یا ایک آدھ لفظ کے فرق کے ساتھ ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں جیسے

دامن تلک بھی ہائے مجھے دسترس نہیں
"کیا خاک میں ملی ہیں مری جاں فشانیاں"

(سراج اورنگ آبادی)

بارا بھی ان نے سان کے غیروں میں مجھ کو میرؔ
"کیا خاک میں ملائیں مری جاں فشانیاں"

(میرؔ)

نیز یوں ہی نہ تھی شب آتشِ شوق
"تھی خبر گرم اُن کے آنے کی" (میرؔ)

"ہے خبر گرم اُن کے آنے کی"
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

(غالب)

"میرے تغیرِ رنگ پر مت جا"
انقلابات ہیں زمانے کے

(میر)

"میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ"
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

(مومن)

"میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ"
یوں بھی اے مہرباں ہوتا ہے

(درد)

ناخن سے بوالہوس کا گلا یوں ہی چھل گیا
"لوہو لگا کے وہ بھی شہیدوں میں مل گیا"

(میر)

گل اُس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا
"یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا" (ذوق)

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
"یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے"
(غالب)

دردِ دل کی کوئی دوا نہ دُعا!
"یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے"
(یاس یگانہ)

"فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں"
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کرے
(سودا)

"فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں"
اِس مختصر سی عمر میں کیا کیا کرے کوئی
(اقبال)

"فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں"
ان مشکلوں سے عہدہ برآئی نہ ہو سکی
(تلوک چند محروم)

ہم پر جو کچھ ہوا اسے ہونا ضرور تھا
"تقصیر آنکھ کی تھی نہ دل کا قصور تھا" (داغ)

"آنکھوں کا تھا قصور نہ دل کا قصور تھا"
آیا جو میرے سامنے میرا غرور تھا

(جگر مرادآبادی)

~~~~~~~~

"ماورائے سخن بھی ہے کچھ بات"
بات یہ ہے کہ گفتگو نہ کرے

(اصغر گونڈوی)

اے کمالِ سخن کے دیوانے
"ماورائے سخن بھی ہے اک بات"

(جگر مرادآبادی)

~~~~~~~~

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
"مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں"

(اقبال)

وفا تجھ سے اے بے وفا چاہتا ہوں
"مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں"

(حسرت موہانی)

~~~~~~~~

فقط بہار میں پیتے ہیں ہم نہیں پیتے
"کبھی بہار سے پہلے کبھی بہار کے بعد" (نوح ناروی)
~~~~~~~~

گذرے ہیں ہم بھی گلستاں میں بارہا لیکن
"کبھی بہار سے پہلے کبھی بہار کے بعد"

(عدمؔ)

کبھی نہ اشک بہائے نہ آہ کی میں نے
"بکھرنے دی نہ محبت کی روشنی میں نے"

(ادیب سہارنپوری)

ترے عتاب سے کتنی نباہ کی میں نے
"بکھرنے دی نہ محبت کی روشنی میں نے"

(عدمؔ)

بس ایک رقص شرر کے سوا نہیں کچھ بھی
"بہت قریب سے دیکھی ہے زندگی میں نے"

(ادیب سہارنپوری)

سوائے موت کے کچھ بھی نظر نہ آیا مجھے
"بہت قریب سے دیکھی ہے زندگی میں نے"

(منظر بریلوی)

مئے رنگیں ہے سادہ پانی بھی
"ہائے کیا چیز ہے جوانی بھی" (آغا حشر)

موت بھی، نیند بھی، کہانی بھی
"ہائے کیا چیز ہے جوانی بھی"

(فراق گورکھپوری)

ایک ہنسنی ہوئی پریشانی
"ہائے کیا زندگی ہماری ہے"

(عدم)

بے قراری ہے، آہ و زاری ہے
"واہ کیا زندگی ہماری ہے"

(اختر صہبائی)

ہر گھڑی شغل آہ و زاری ہے
"واہ کیا زندگی ہماری ہے"

(ہما ہرنالوی)

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
"کچھ ہماری خبر نہیں آتی"

(غالب)

کچھ تمہارا پتہ نہیں چلتا
"کچھ ہماری خبر نہیں آتی"

(عدم)

دل کی وحشت کا کیا علاج کریں
"پیار آتا ہے، پیار کرتے ہیں"

(عدم)

پیار کرنے سے روکتے کیوں ہو
"پیار آتا ہے پیار کرتا ہوں"

(حفیظ ہوشیار پوری)

پیار کی کچھ نہ پوچھئے ساحرؔ!
"پیار آتا ہے پیار کرتا ہوں"

(ساحر کپور تھلوی)

لوگ کیا کیا نہ ہار بیٹھے ہیں
"زندگی کے قمار خانے میں"

(فراقؔ گورکھپوری)

"زندگی کے قمار خانے میں"
ہوتی رہتی ہے ہار جیت کی بات

(عدم)

حسین تیری آنکھیں حسین تیرے آنسو
"یہیں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے" (جگر مراد آبادی)

محبت کا دریا جوانی کی لہریں
"یہیں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے"

(امجد نظمی)

کہے جائیں گے دردِ دل ہم اپنا
"کسی کو اعتبار آئے نہ آئے"

(جلیل مانکپوری)

کسی کی یاد میں آنسو رواں ہیں
"کسی کو اعتبار آئے نہ آئے"

(ساحر کپور تھلوی)

اگرچہ یہ ہم آہنگی صرف مصرعوں تک محدود نہیں ہے۔ غزل میں بندھے ٹکے سانچے اور قوافی اور بحور کی یکسانی کی وجہ سے اندازِ بیان کی خفیف سی تبدیلی کے سامنے پورے کا پورا شعر بھی ٹکرا سکتا ہے۔ اس لئے اس ٹکراؤ سے بھی سرقہ اور توارد کے سلسلے میں کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا جیسے

گرا ہے مانگ میں دل اب اسے میں ڈھونڈوں کدھر
کہ آدھی رات اِدھر ہے اور آدھی رات اُدھر

(خلیفہ محمد علی سکندر شاگرد ناسخ)

چھپا ہے مانگ میں دل اب اسے میں ڈھونڈوں کدھر
کہ آدھی رات اِدھر ہے اور آدھی رات اُدھر

(عماد الملک غازی الدین خاں نظام)

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا!
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

(سراج اورنگ آبادی)

چلی بادِ گرمِ فراق ہے جلا سب وجود نیاز کا
مگر ایک عشق کی کشتِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

(شاہ نیاز احمد نیاز)

گزار شہرِ وفا میں سمجھ کے کر مجنوں
کہ اس دیار میں میرؔ شکستہ پا بھی ہے

(میر)

سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سوداؔ برہنہ پا بھی ہے

(سودا)

جانیں مشتاقوں کی لب تک آ گئیاں
بل بے ظالم تیری بے پروائیاں

(یہ شعر میر محمدی بیدار اور خواجہ ہینگا شیدا دونوں کے کلام میں موجود ہے)

آنکھیں برنگِ نقشِ قدم ہو گئیں سفید
نامے کے انتظار میں قاصد بھلا پھرا
(میر)

آنکھیں برنگِ نقشِ قدم ہو گئیں سفید
اس سے زیادہ خاک کروں انتظارِ خط
(سودا)

دیکھا نہیں جمال کبھی آیا نہیں پیام بھی!
دیر ہوئی کہ ایک سی حالتِ چشم و گوش ہے
(ناسخ)

نے مژدۂ وصال، نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیٔ چشم و گوش ہے
(غالب)

چمن میں گل نے جو کل دعوئ جمال کیا
جمالِ یار نے منہ اس کا خوب لال کیا (میر)

برابری کا تری گل نے جب خیال کیا
صبا نے مار طمانچہ منہ اس کا لال کیا

(حیدری)

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا!
لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا

(مظہر جان جاناں)

کب میں کہتا ہوں کہ تیرا میں گناہگار نہ تھا
لیکن اتنی تو عقوبت کا سزاوار نہ تھا

(قائم چاندپوری)

کیا کہیئے کہ خوباں نے اب ہم میں ہے کیا رکھا
ان چشم سیاہوں نے بہتوں کو سلا رکھا

(میر)

وہ سرمہ بھری آنکھیں فتنہ ہیں کہ جادو ہیں
کتنوں کو جگا رکھا، کتنوں کو سلا رکھا

(امیر)

مت جا نمو کہ ہوگا یہ بے درد اہلِ دیں
گر آوے شیخ پہن کے جامہ قرآن کا (ذوق)

جھوٹ ہی جانوں کلام اس رہزنِ ایمان کا
پہن کر جامہ بھی وہ آوے اگر قرآن کا

(ذوقؔ)

سروِ عاشق ہو گیا اس غیرتِ شمشاد کا
غل مچایا قمریوں نے بھی مبارکباد کا

(ناسخؔ)

(اور یہی مطلع ذوقؔ دہلوی کے دیوان میں بھی موجود ہے)

اے بتو! اس قدر جفا ہم پر
عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم

(میرؔ)

ٹک تو کر رحم اے بتِ بے رحم
آخرش بندۂ خدا ہیں ہم

(جرأتؔ)

گلہ ہیں جس سے کر دں تیری بے وفائی کا
جہاں میں نام نہ لے پھر وہ آشنائی کا

(امیرؔ)

گلہ لکھوں میں اگر تیری بے وفائی کا
لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا

(سودا)

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

(غالب)

کوچۂ یار میں میں نے تسکیںؔ
پاؤں رکھا تھا کہ سر یاد آیا

(میر حسن تسکین)

یہ لاشِ بے کفن اسدِؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

(غالب)

کہتے ہیں ذوقؔ آج جہاں سے گزر گیا
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

(ذوق)

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد (غالب)

گرم بازاریٔ الفت ہے مجھی سے ورنہ
کوئی لینے کا نہیں نامِ وفا میرے بعد

(منور خاں غافل)

یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

(یاسمن کنیز شاگرد انشاء)

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

(غالب)

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات
رو کر گزار یا اُسے ہنس کر گزار دے

(ذوق)

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے
تھوڑی سی رہ گئی اُسے بھی گزار دے

(آغا جان عیش)

کہا اُس بُت سے جب مرتا ہے مومن
کہا میں کیا کروں، مرضی خدا کی (مومن)

کہا جب میں کہ بے تیرے ہوں مرتا
تو کہتا ہے وہ بُت مرضی خدا کی

(خواجہ وزیرؔ)

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا
دیر تلک میں اُسے دیکھا کیا

(مومنؔ)

آئینۂ دل نے تماشا کیا
اپنی جگہ میں اُسے دیکھا کیا

(داغؔ)

امیدِ وصل جز طمعِ خام کچھ نہیں
ہر صبح ہے قسم پہ قسم شام کچھ نہیں

(میر سوزؔ)

(اور یہی شعر کلیاتِ سوداؔ میں بھی موجود ہے)

سُنا جو نزع میں قرآں رہی نہ جسم میں روح
زبان بند ہوئی سن کے گفتگو تیری

(مرزا متعشقؔ)

سنا ہے ہم نے بھی قرآں قسم ہے قرآں کی
جواب ہی نہیں رکھتی ہے گفتگو تیری

(خواجہ آتش)

اُن کے جانے سے یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

(حالی)

رہی آشفتہ سری سے نہ وہ گھر کی صورت
وہی دیوار کی صورت ہے جو در کی صورت

(داغ)

زیست کا اعتماد کیا ہے امیر
آدمی بلبلہ ہے پانی کا

(امیر)

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
آدمی بلبلہ ہے پانی کا

(حالی)

تارے گنتے ہو شام سے شب ہجر
کیا کرو گے اگر سحر نہ ہوئی

(داغ)

ہجر کی رات کاٹنے والے
کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی

(عزیز لکھنوی)

~~~~~~

نہ دیکھا ہو کبھی نے حباب میں دریا
وہ دیکھ لے مری چشمِ پُرآب میں دریا

(مفتی صدرالدین خاں آزردہ)

ازل سے بند ہے چشمِ پُرآب میں دریا
عجب یہ ہے کہ بھرا ہے حباب میں دریا

(فطرت)

~~~~~~

خط لکھ کے اور بھی ہیں پڑا پیچ و تاب میں
کیا جانے لکھ دیا اسے کیا اضطراب میں

(ذوق)

سُنتا ہوں رات بھر وہ رہے پیچ و تاب میں
کیا جانے لکھ دیا انہیں کیا اضطراب میں

(جوش ملسیانی)

~~~~~~
~~~~~~

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

(ظہیر دہلوی)

کچھ غمِ عشق بھی کر دیتا ہے مجنوں عدمؔ
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

(عدمؔ)

چمن میں گریۂ شبنم غلط سہی لیکن
سوال یہ ہے کہ پھولوں کو کیوں ہنسی آئی

(احسان دانش)

چمن میں کون تھا پرسانِ حالِ شبنم کا
غریب روئی تو پھولوں کو بھی ہنسی آئی

(عرش ملسیانی)

خوشبو اُڑا کے لائی نہ زلفِ نگار سے
مجھ کو شکایتیں ہیں نسیمِ بہار سے

(اختر شیرانی)

لائی نہیں پیام کوئی زلفِ یار سے
مجھ کو شکایتیں ہیں نسیمِ بہار سے

(سراج الدین ظفرؔ)

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

(فراقؔ گورکھپوری)

اپنوں کی موت نے مری دنیا اجاڑ دی
یاروں نے دور جا کے بسائی ہیں بستیاں

(حفیظؔ جالندھری)

اس ضمن میں جوشؔ ملسیانی کے ایک مضمون "شعرا کا ذہنی ارتقا" کا یہ اقتباس خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

" ایک دوسرے سے دور صدہا میل کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے شعرا کے نتائجِ فکر کا لڑ جانا قابلِ تعجب نہیں۔ مثلاً ایک دفعہ کسی رسالے میں یہ طرحی مصرعہ شائع ہوا تھا ع

اب اُس کی آرزو ہے اور میں ہوں

اِس زمین میں آٹھ دس شعرا کا مطلع یہ تھا :۔

کمر کی جستجو ہے اور میں ہوں   عدم کی آرزو ہے اور میں ہوں"

اسی نوعیت کا ایک واقعہ مولوی حکیم محمد نجم الغنی رامپوری نے بھی اپنی تصنیف "بحرالفصاحت" میں تحریر کیا ہے۔

"ایک مرتبہ لشکر گوالیار میں مشاعرہ ہوا اور یہ طرح ہوئی :-

کیا جانے لکھ دیا اُسے کیا اضطراب میں

مولوی سید اکبر حسین صاحب بیخود بریلوی مسکن بدایونی موطن کا مطلع تھا۔

ساقی کا عکسِ رخ نہیں جامِ شراب میں
ہے آفتاب جلوہ نما آفتاب میں

انہیں دنوں میں چودھری سعید الدین حسین صاحب رئیس کھیڑہ بدایونی نے مجلسِ مشاعرہ ترتیب دی تھی اور وہاں بھی یہی طرح ہوئی تھی۔ مولوی احمد حسین صاحب وحشت بدایونی جو پرانے شاعر اور ایک نیک آدمی ہیں اُن کا بھی مطلعِ غزل یہی تھا۔ ایک کو دوسرے کے شعر سے اطلاع تو درکنار نام سے بھی واقفیت نہیں تھی اور اتنا زمانہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اُن کا شعر ان تک پہنچتا۔ یعنی ایک ہی ہفتہ میں دونوں جگہ مشاعرہ ہوا تھا"

چنانچہ طرحی مشاعروں میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ شعراء کے مصرعے اور شعر محض چند الفاظ کے ہیر پھیر سے دوسرے شاعروں کے مصرعوں

اور شعروں سے متصادم ہو جاتے ہیں۔ اس تصادم کی ذمہ داری صرف قوافی اور بحور کی یکسانی ہی پر عائد کی جا سکتی ہے۔ غزلیہ شاعری میں چونکہ ہر قافیہ ایک انفرادیت کا حامل ہوتا ہے اور اس سے مخصوص خیالی "تلازمات" اور ذہنی متعلقات بیک وقت کئی شعرا کے ہاں پیدا ہو سکتے ہیں اس لئے دو علیٰحدہ بحروں کے شعر بھی محض قافیہ کی یکسانی کی وجہ سے ٹکرا سکتے ہیں جیسے۔

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

(میر)

لوگ جب تیرا نام لیتے ہیں
ہم کلیجے کو تھام لیتے ہیں

(سید امام اثر)

(سید امام اثر کی غزل کا یہ مطلع لفظ بہ لفظ عدم کی ایک غزل کا مطلع بھی ہے)

جن کے نامے پہنچتے ہیں تجھ تک
کاش اُن کا میں نامہ بر ہوتا

(سوز)

جنوں کے نامے پہنچتے ہیں یار تک دن رات
انہیں کا کاش کہ جرأتؔ بھی نامہ بر ہوتا

(جرأتؔ)

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں بتاؤ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

(غالبؔ)

مجھ سے کہتے ہیں وہ کہ تو کیا ہے
کون پوچھے یہ گفتگو کیا ہے

(نثار علی خاں نثارؔ)

ہمیں تو ہوش نہیں یہ تو سچ کہا لیکن!
جھجک کے بات نہ کرتے اگر پئے ہوتے

(نخشبؔ جارچوی)

وہ ملے بھی تو اک جھجک سی رہی
کاش تھوڑی سی ہم پئے ہوتے

(عدمؔ)

کہیو قاصد جو وہ پوچھے ہمیں کیا کرتے ہیں
جان و ایمان و محبت کو دعا کرتے ہیں (میرؔ)

وہ جو پوچھے ہمیں کیا کرتے ہیں
کہیو قاصد کہ دعا کرتے ہیں

(اسیر)

لیکن سوال یہ ہے کہ ہم زمین اور ہم قافیہ شعروں کے علاوہ جب مختلف زمینوں اور قافیوں میں بھی الفاظ و بیاں کے معمولی سے فرق کے ساتھ اشعار کے مضمون اور خیال لڑ جائیں تو کیا انہیں سرقہ قرار دیا جائے گا یا توارد۔ جیسے

تھا بندھا جس میں نامہ دلبر کا
وہی پَر گر پڑا کبوتر کا

(عندلیب)

قسمت کی خوبی دیکھو کبوتر کا گر پڑا
وہ پَر کہ جس میں تھا مرا نامہ بندھا ہوا

(میر)

وائے ناکامی کہ جس میں ہم نے باندھا خطِ شوق
وہی مرغِ نامہ بر کا ٹوٹ کر شہپر گرا

(داغ)

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں

(سودا)

تیر ناوک کو ترے دیکھ کے ہے لوٹ رہا
طائرِ قبلہ نما خاک کرے گا طیراں

(ذوق)

تفاوت قامتِ یار اور قیامت میں ہے کیا ممنوں
وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

(ممنون)

ترے سروِ قامت سے اِک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

(غالب)

نہیں شایانِ زیب گنبدِ دستار کچھ زاہد
مگر مسواک ہی اس پر کلس ہووے اگر ہووے

(سودا)

دیکھیو ناسخ سرِ شیخِ معمم کی طرف
کیا کلس مسواک کا ہے گنبدِ دستار پر

(ناسخ)

ساقی ہے یک تبسمِ گُل موسمِ بہار!
ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

(سودا)

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کو خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

(غالب)

~~~~~~~~~~

چارہ گر ہو جو ترا لطف تو پھر کیا ہے عجیب
مشکِ سودہ کرے ہر زخم پہ کارِ مرہم

(ذوق)

اشیائے جہاں سے جو کریں دفعِ ضرر وہ
زخموں کے لئے مشک میں مرہم کی ہو تاثیر

(امیر)

~~~~~~~~~~

رکھو کسی طرح تو سرو کار میری جاں
کرتے رہو جفا ہی وفا گر نہ ہو سکے

(ناسخ)

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے!
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی (غالب)

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
وہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

(غالبؔ)

نہ جاؤں گا کبھی جنّت کو میں جاؤں گا
اگر نہ ہوئے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا

(مومنؔ)

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

(غالبؔ)

شب تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

(مومنؔ)

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

(غالبؔ)

جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں؟
کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی (مومنؔ)

وہ ناتواں ہوں کہ ہوں اور نظر نہیں آتا
مرا بھی حال ہوا ہے تری کمر کا سا

(مومن)

راز ہوں ایسا کسی کو بھی نظر آتا نہیں
عشق میں گھل کر کمر کی یار کا مو ہو گیا

(آتش)

کاہش غم سے ہجر میں نوابؔ
کہیں تیری کمر نہ ہو جائے

(نواب کلب علی خاں)

خیالِ زلفِ دوتا میں نصیرؔ پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

(نصیر)

سر دے مار گیسوئے جاناں کی یاد میں
پیٹا کرو لکیر کہ کالا نکل گیا

(رند)

کس لئے لطف کی باتیں ہیں پھر
کیا کوئی اور ستم یاد آیا

(شیفتہ)

مکرر بلا آنے والی ہے کوئی!
نہیں بے سبب مہربانی تمہاری

(نسیم دہلوی)

~~~~~~

بند آنکھیں کیئے رہتا ہوں پڑا
خواب میں آئے نظر تا کوئی

(جرأت)

رات بھر آنکھوں کو اس اُمید پر رکھتا ہوں بند
خواب میں دیکھوں کہ شاید طالعِ بیدار کو

(آتش)

~~~~~~

ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں
جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارہ نہیں آتا

(ذوق)

کیسے عدم کے لوگ مسافر نواز ہیں
کوئی یہاں سے جا کے وہاں سے پھرا نہیں

(آتش)

~~~~~~

یہ کہہ کر جسم کا پشتارہ پھینکا روح نے آخر
مرے سر مفت کی آٹھوں پہر بیگار کیسی ہے (آتش)
~~~~~~

اس مشقت سے اُسے خاک نہ ہوگا حاصل
روح کیوں جسم کی بے گار لئے پھرتی ہے

(جلیل)

اے اجل دی تو نے بارِ جسم سے آخر نجات
کب سے میری پیٹھ پر یہ خاک کا پشتارہ تھا

(ناسخ)

~~~~~~

دستِ نازک کی نزاکت جو سپر نے دیکھی
ایسی سمٹی کہ ہتھیلی کا بنی تل قاتل

(خواجہ وزیر)

جوڑے ہوئے ہاتھوں کو ادب سے ہے جلا جل
سمٹی سپر ایسی کہ ہتھیلی کا بنی تل

(مرزا دبیر)

~~~~~~

خواب میں تجھ سے ہم کنار رہا
عین غفلت میں ہوشیار رہا

(وزیر)

اپنی غفلت ہے عین ہشیاری
خواب میں ہم نے یار کو دیکھا (گویا)

عبث کرتا ہے تو ہم سے خیالِ یار کا شکوہ
جو بھولے آپ کو اے دل اسے پھر یاد کیا کیجئے

(امانت)

غم عبث، شادی عبث، نالہ و فریاد عبث
بھولے جو آپ کو اس شخص کی پھر یاد عبث

(ہجر)

~~~~~~~

جو موت آئے تو پہچانے نہ مجھ کو
ہوا ہوں ہجر میں لاغر یہاں تک

(جرأت)

لاغر ہوں اس قدر کہ مجھے پہچانتی نہیں
رہ رہ کے دیکھتی ہے قضا سر سے پاؤں تک

(امیر)

~~~~~~~

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

(غالب)

ہوئی ہے مردمِ دنیا کی صورت سے یہ بیزاری
گماں ہوتا ہے اپنے سائے پر بھی مجھ کو دشمن کا (آتش)

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر گئے پر نہ لگا جی تو کدھر جائیں گے

(ذوقؔ)

عدم کو یاں سے تو گھبرا کے اے اجل جاتے
وہاں بھی جی جو نہ لگتا کہاں نکل جاتے

(امیرؔ)

~~~~~~

رسم و آئین اسیری کے مجھے یاد نہیں
نو گرفتار ہوں اے ہم نفسو سکھلا دو

(میر سوزؔ)

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ
اے اسیرانِ قفس میں نو گرفتاروں میں ہوں

(امیرؔ)

~~~~~~

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں یاد اُسے غالبؔ
جفا میں اُس کی ہے انداز کار فرما کا

(غالبؔ)

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں (منولال صفاؔ)

نکلتا ہے جو ہر گُل زر بکف گلزارِ عالم میں
خدا جانے زمیں میں دفن یہ کیسا خزانہ ہے

(ناسخ)

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گُل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

(آتش)

آسیا کہتی ہے ہر صبح بآوازِ بلند
رزق سے بھرتا ہے رزّاق دہن پتھر کے

(میر کلو عرش)

مُنہ جس نے دیا وہ رزق دے گا
گویا یہ دہانِ آسیا ہے

(وزیر)

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر
فعلِ بد تو اُن سے ہو لعنت کریں شیطان پر

(انشا)

شیطنت سے کرے انسان تو سب کام خراب
کیا تماشہ ہے کہ شیطان کا ہو نام خراب (بہادر شاہ ظفر)

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر
ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

(آتش)

رونے والے نہ تھے غربت کی اجل پر نہ سہی
ہنسنے والا تو وہاں کوئی دلِ زار نہ تھا

(ناطق)

ارض وسما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

(خواجہ درد)

دونوں جہاں میں تو نہ سمائی ہوئی تری
اے حسنِ یار اب مرے دل میں سما کے دیکھ

(جلیل)

ہنگامِ ازل مجھ کو جو ساقی نے دیا تھا
اس جام کا ہے کیف ابھی تک مرے سر میں

(صفی لکھنوی)

ایک ساغر پیا تھا روزِ ازل
آج تک لڑکھڑا رہا ہوں میں

(عدم)

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

(آتش)

سایہ بہت ملے گا درختوں کی راہ میں!
گھر سے نکل کے دھوپ میں کچھ اور چل کے چل

(حفیظ جونپوری)

~~~~~~

پینے سے کام رکھتے ہیں رندِ سیاہ مست
کمبل ہی تان لیں گے جو ابرِ کرم نہیں

(جلال)

فقیرِ مست کسی فصل کے نہیں پابند
پئیں گے تان کے کمبل سحاب ہو کہ نہ ہو

(حفیظ جونپوری)

میں کام لوں گا ابر کا اے رند تان کر
تو مجھ فقیرِ مست کا کمبل اٹھا تو لا

(ریاض خیر آبادی)

~~~~~~

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

(سیماب اکبرآبادی)

میں جو کہتا ہوں وہ ہوتی ہے کہانی سب کی
اک زمانے کی صدا ہے مری آواز ہے کیا

(منور لکھنوی)

جب آئی جوش پہ میرے کریم کی رحمت
گرا جو آنکھ سے آنسو دُرِ یگانہ ہوا

(امیر مینائی)

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

(اقبال)

ظاہر ہے کہ ان شعرائے کرام میں سے کسی پر یہ الزام عائد کرنا آسان نہیں کہ اس نے دوسرے شاعر کا سرقہ کیا ہے۔ حالانکہ مذکورہ مثالوں سے کافی حد تک یہی بات ثابت ہوتی ہے اس مقام پر مجھے بے اختیار ایک امریکی شاعر اور مصنف ہالمس کی یہ بات یاد آرہی ہے کہ :-

*Honest Thinkers are always Steal-
ing unconcisusly from each other.*

غزل میں وسعتوں کی لاکھ گنجائش سہی لیکن اس کی داخلی اور ہیئتی

فضا کے محدود ہونے میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اس فضا میں بڑے سے بڑا منفرد اور طبّاع غزل گو سو فیصدی طبع زاد شعر نہیں کہہ سکتا ہزار احتیاط اور کوشش کے باوجود وہ ایسے شعر کہنے پر مجبور ہو گا جن میں غزلیہ شاعری کی کوئی نہ کوئی روایت اپنے آپ لو دے اٹھے گی۔ اور اس کے شعروں میں پہلے سے کہے ہوئے اشعار کی گونج واضح طور پر لہراتی ہوئی محسوس ہو گی۔

غزل کے موضوعات محدود ہیں اور ان موضوعات سے متعلقہ تشبیہات و استعارات تک مخصوص ہیں۔ اسی وجہ سے سرقہ اور توارد کی سب سے زیادہ مثالیں غزلیہ اشعار ہی میں ملتی ہیں۔

نہ صرف ایسا ہو سکتا ہے بلکہ جیسا کہ مذکورہ بالا مثالوں سے ظاہر ہے اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک خیال جسے کوئی شاعر اپنی غزل کے کسی شعر میں پیش کر چکا ہے، اسلوب کی تبدیلی کے ساتھ کسی دوسرے شاعر کے ہاں بھی مل گیا جب کہ دونوں شاعر اپنی اپنی جگہ اسے اپنا اور محض اپنا تخلیقی کارنامہ قرار دیتے رہے۔

لہٰذا اس امر کے امکان سے تو کسی طرح انکار ممکن نہیں کہ ایک خاص قسم کی ذہنی اور جذباتی فضا اور داخلی اور باطنی کیفیت جس میں کوئی شاعر اپنے کسی نفسیاتی عمل یا تجربے کو شعر کا روپ بخشتا ہے۔ وہی

فضا اور کیفیت اسی عمل اور تجربے کی آنچ کے ساتھ پھر کسی شاعر کے دل و دماغ پر طاری ہو کر اُسے بھی اسی قسم کے شعر کی تخلیق پر مجبور کر سکتی ہے اس حقیقت کے پیشِ نظر غزلیہ شاعری میں سرقہ اور توارد دونوں ہم معنی یا بے معنی ہو جاتے ہیں۔

لیکن یہ حقیقت کا صرف ایک رُخ ہے۔ اس حقیقت کے ساتھ ساتھ اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ شاعروں کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا عین فطری اور ارتقائی تقاضہ ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ہر دور میں ہر شاعر اپنے پیش رو اور ہم عصر شاعروں سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ یہ اثرات خواہ اس نے شعوری طور پر اپنائے ہوں یا غیر ارادی طور پر اس کی شاعری میں در آئے ہوں، بہر کیف ہر دور اور ہر نسل کے شاعروں میں دوسروں کے اثرات کی پرچھائیاں واضح اور نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

مثال کے طور پر میرؔ اور غالبؔ ہی کو لیجیئے۔ دونوں آسمانِ شعر و ادب کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ کسی پر کسی کو ترجیح دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ دونوں اپنے اپنے وقت کے تاریخ ساز اور صاحبِ طرز غزل گو تھے۔ دونوں کی شاعرانہ شخصیتیں بھی ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھیں۔ ایک احساس کا شاعر تھا تو دوسرا

فکر کا۔ میرؔ کی شاعری کا غالب رجحان گداز ہے۔ سوز اور درد سے اُن کے مزاج کا خمیر اٹھا ہے۔ اُن کے زیادہ تر اشعار نہایت غمناک احساسات کی پیداوار ہیں۔ مجنوںؔ گورکھپوری کے بقول اُن کی آواز نہایت شائستگی کے ساتھ اپنے زمانے کے سارے کرب و اضطراب کو ظاہر کر رہی ہے۔ اور غالبؔ کی شاعری کا بنیادی عنصر تفکر ہے۔ اُن کا تجزیہ و تحلیل کرنے والا شعور انسانی تجربات و محسوسات کا صرف مشاہدہ ہی نہیں کرتا ہے بلکہ ان کی تہہ میں ڈوب کر ایسے ایسے لازوال اشعار کی تخلیق کرتا ہے جن کی ہمہ گیری اور آفاقیت ہر دور میں مسلّم رہے گی۔ سردار جعفری نے ان دونوں عظیم فنکاروں کی شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ غالبؔ کی شاعری کے عاشق میں انانیت اور خود پرستی ہے اور میرؔ کی شاعری کے عاشق میں مظلوم اور جھنجلائے ہوئے آدمی کا جذبۂ انتقام ہے لیکن اس غیر معمولی ذہنی تفاوت کے باوجود غالبؔ میرؔ سے بے حد متاثر تھے اور اس کا انہیں شعوری طور پر احساس بھی تھا جبھی تو انہیں یہ کہنا پڑا۔

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

اور بے پناہ طبّاعی، خلّاقی اور جدّت طرازی کے باوجود اُن کے

کلام میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جنہیں دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ارادی یا غیر ارادی طور پر اس خدائے سخن کے اشعار کی رہنمائی میں کہے گئے ہیں جس نے ان کا بالکل ابتدائی کلام دیکھ کر یہ پیش گوئی کی تھی کہ

"اس لڑکے کو اگر کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا۔ ورنہ مہمل بکنے لگے گا"

مثلاً غالب کہتے ہیں

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

اور اس بات کو میر اپنے مخصوص انداز میں اس طرح کہہ چکے ہیں کہ

جگہ ہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک
پلک تک گیا تو تلاطم کیا

ظاہر ہے کہ میر کے شعر میں غالب کے شعر سے زیادہ کسک ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ حسرت ناک مضمون میر کے طبعی میلان سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

یا غالب کا ایک بہت مشہور مطلع ہے۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں!
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

فارسی شاعری میں یہ مضمون عام ہے۔ خیام نے بھی اسے اپنی بعض رباعیات کا موضوع بنا لیا ہے۔ جیسے۔

در ہر دشتے کہ لالہ زارے بودست
آں لالہ ز خونِ شہریارے بودست
ہر برگِ بنفشہ کز زمیں مے روید
خالیست کہ بر رُخِ نگارے بودست

لیکن غالب کے اس مطلع کی بنیاد میر کا یہ شعر معلوم ہوتا ہے جس کا اندازِ بیان نسبتاً زیادہ دردناک ہے۔

کو گل و لالہ کہاں سنبل سمن ہم نسترن
خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا

اور اسی مضمون کو اپناتے ہوئے ناسخ نے بھی یہ شعر کہہ دیا۔

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں
اس لئے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا

ناسخ کا اندازِ بیان لاکھ مدلل سہی لیکن میر کے شعر کی رمزی

کیفیت کا کیا جواب ہے۔

غالب کا شعر ہے

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

شعر کا اندازِ بیاں اگرچہ دلچسپی سے خالی نہیں، لیکن میر اسی مضمون کا اس سے زیادہ سلیس اور سلجھا ہوا شعر کہہ چکے ہیں۔

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا

اور مرزا غالب کا یہ شعر۔

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

جوش ملسیانی کے الفاظ میں واقعی لاجواب اور غیر فانی شعر ہے اور اس کی خوبی بیان کی طاقت سے باہر ہے لیکن حقیقت میں میر کے اس شعر کا عکسِ جمیل معلوم ہوتا ہے۔

سراہا اُن نے ترا ہاتھ جن نے دیکھا زخم
شہید ہوں میں تری تیغ کے لگانے کا

اور یہ دونوں شعر فیاض لاہجی کے اس شعر سے ماخوذ نظر آتے ہیں

ہر کس کہ زخم کاری ما را نظارہ کرد!
تا حشر دست و بازوئے او را دعا کند

اور غالب کے اس شعر میں :-

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

بلاشبہ "دم" کے پہلو دار استعمال نے شعر میں جان ڈال دی ہے لیکن میر نے اس مضمون کو زیادہ بے تکلفی سے ادا کیا ہے۔

گو کہ آتش زباں تھے پہلے میر
اب کی کہیئے گئی وہ تب کی بات

اور غالب کے اس شعر میں :-

ترے ہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیئے

بیان کی شوخی اور احساس کی شگفتگی کا کیا جواب ہے۔ محبوبہ کے اشاروں کے جادو نے ایسا فریب دے رکھا ہے کہ عاشق کو یقین ہے کہ اُس کے دل کا حال معشوق سے مخفی نہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ مرزا کا یہ شعر میر کے اس شعر کی شائستہ تر صورت ہے :-

جب دردِ دل کا کہنا میں دل میں ٹھانتا ہوں
کہتا ہے بن سنے ہی میں خوب جانتا ہوں

مرزا غالب کا ایک اور مطلع ہے :-

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

اس زمین میں ہر شعر قدرتی طور پر تنافر کے عیب کا شکار ہوگا۔ اور ردیف میں ہ کی تکرار صوتی کراہت کا باعث ہوگی۔ لیکن اس سقم سے قطعِ نظر شعر کے نفسِ مضمون کو میر اپنے یہاں یوں ادا کر چکے ہیں :-

کون کہتا ہے نہ غیروں پہ تم امداد کرو
ہم فراموش ہوؤں کو بھی کبھی یاد کرو

اور یہاں " فراموش ہوؤں " نے جو کرب ناک تاثر پیدا کیا ہے اس کی گہرائی کا کیا ٹھکانا ۔

مرزا غالب کا شعر ہے :-

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

حق تو یہ ہے کہ مرزا نے خندۂ گل کو خندۂ بے جا کہہ کر بلاغت کا حق ادا کر دیا ہے لیکن یہی مضمون میر کے یہاں پہلے سے موجود ہے

اور میر کی فطری بدمزاجی سے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے اس میں تیکھا پن بھی زیادہ ہے۔

ہمیں تو باغ کی تکلیف سے معاف رکھو
کہ سیرِ گلشن نہیں رسمِ اہلِ ماتم کی

ویسے یہ مضمون دونوں نے ابوتراب تراب سے مستعار لیا ہے۔

نکہتِ گل رسانہ پیغامے
بے رباعی نہ داد ہیچ جواب

اسی مضمون کو بنیاد بنا کر انشا نے نفیس ترین شعر کہا ہے کہ:۔

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

غالب کا شعر ہے:۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

شعر میں قیامت کا لفظ واقعی قیامت ہے اور پھر خدا کی رعایت سے محبوب کو کافر کہہ کر شعر میں تضاد کا لطف بھی پیدا کر دیا گیا ہے۔ لیکن شعر کا نفسِ مضمون اور بنیادی میلان در اصل میر کے اس شعر کی ترقی یافتہ صورت ہے۔

عشق تو ان کو ہے جو یار کو اپنے دم رفتن!
کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے

غالب کا شعر ہے:۔

دل نہیں ورنہ دکھاتا تم کو داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کہوں کیا کارفرما جل گیا

اور اس کی تخلیق کا محرک میر کا یہ شعر معلوم ہوتا ہے:۔

کیوں نہ ہو فتح ضعف اعضا پر
مر گئے اس قشون کے سردار

غالب کا یہ شعر:۔

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

بے شک اردو کے بہترین اور زندۂ جاوید اشعار میں سے ہے اور قوتِ بیانیہ کے شاہکار کا درجہ رکھتا ہے، لیکن اس حقیقت کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس شاہکار میں رنگ بھرنے کے لئے شعوری یا غیر شعوری طور پر مرزا نے استفادہ میر کے اس شعر سے کیا ہے:

عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں
لگ گئی یہ آگ ناگاہی کہ سب گھر پھک گیا

اسی طرح غالب کا ایک اور سلگتا ہوا شعر ہے :۔

جلتا ہے جی کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے

اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف

جلنے کی وجہ سے جس خوبی سے اپنے دل کو جلایا گیا ہے اس کی داد نہیں دی جا سکتی ۔ لیکن کیا عجب کہ اس شعر کا شرار بھی میر کے اس شعر کے شعلے سے پھوٹا ہو ۔

ادھر جلا لالہ ساں رہا تو کیا

داغ بھی ہو تو کوئی بالکل ہو

اور غالب کا یہ شعر :۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

برجستگی کی نہایت عمدہ مثال ہے لیکن قیاس کہتا ہے کہ اس برجستگی کو بھی میر کے اس شعر سے تراشا گیا ہے ۔

بھاگے مری صورت سے وہ عاشق میں اس کی شکل پر

میں اس کا خواہاں یاں تلک وہ مجھ سے بیزار اس قدر

غالب کا بہت مشہور شعر ہے :۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن　　خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

جو نہایت صاف اور سلجھے ہوئے مضمون کا حامل ہے لیکن میرؔ
کے اس شعر کا مرہونِ منت معلوم ہوتا ہے۔

بالیں پہ میرے گھر سے تو آوے گا جب تلک
کر جاؤں گا سفر ہی میں دنیا سے تب تلک

غالبؔ کا یہ شعر:۔

فراغت کس قدر ہوتی مجھے تشویشِ مرہم سے
بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

اُن کے نکتہ آفریں تفکّر کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ دل کے ٹکڑے
نمکداں کی لذّت کے اس حد تک حریص ہو گئے کہ ایک دوسرے پر سبقت
لے جانے کی کوشش میں باہم لڑنے لگے اور میں نے اُن کے جھگڑے
سے تنگ آکر انہیں اس لذّت ہی سے محروم کر دیا لیکن مرزا نے
شاعرانہ تکلّف سے جو بات کہی ہے وہ میرؔ کے اس بے تکلّف شعر سے
عبارت معلوم ہوتی ہے۔

ریزۂ الماس یا مشتِ نمک ہے کیا بُرا
جو میں اپنے ایسے زخمِ سینہ کو مرہم کروں

میرؔ کے شعر میں احساس کی جو کسک اور چبھن ہے وہ غالبؔ
کے شعر میں نہیں۔

غالب کا شعر ہے :-

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

مرزا نے اگرچہ نہایت فن کاری سے آنسو کو موتی پر ترجیح دینے کا اضافہ اپنی طرف سے کیا ہے لیکن بنیادی طور پر یہ شعر میر کے اس شعر کی دین ہے۔

مت ڈھلک پلکوں سے میرے اے سرشکِ آبدار
مفت ہی جاتی رہے گی تیری موتی کی سی آب

اس ضمن میں ناسخ کا یہ شعر بھی قابلِ غور ہے :-

مری آنکھوں سے کیا نسبت کہ قطرہ آبِ نیساں کا
دُرِ نایاب ہو سکتا ہے، آنسو ہو نہیں سکتا

اور غالب کا شعر بھی

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

میر کے اس مقطع سے ماخوذ ہے۔

مرنے کے بعد مری قبر پہ آیا وہ میر — یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

غالب کا شعر ہے :-

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری — تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

جس میں "آئینہ بینی" کی بجائے "آئینہ داری" اگرچہ محلِ نظر ہے لیکن یہ شعر بھی میرؔ کے اُس شعر کا عکس معلوم ہوتا ہے۔

کب تک آئینے کو یہ حسن قبول!
مُنہ ترا اس طرف کبھی تو ہو

اور غالبؔ کا یہ شعر بھی کہ:۔

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

میرؔ کے اس شعر کا مرہونِ منت ہے۔

عشق کرتے ہیں اس پری رو سے
میرؔ صاحب بھی کیا دوانے ہیں

غالبؔ کا شعر ہے:۔

آنکھ کی تصویر سر نامہ پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھل جائے کہ مجھ کو حسرتِ دیدار ہے

اور مزے کی بات یہ ہے کہ غالبؔ کے ہم عصر ذوقؔ نے بھی قریب قریب اسی خیال کو اس طرح نظم کیا ہے۔

یہ چاہتا ہے شوق کہ قاصد بجائے مہر
آنکھ اپنی ہو لفافۂ خط پہ لگی ہوئی

لیکن ان دونوں شعروں کے ہوتے میر کے اس شعر سے چھوٹے ہیں۔

وہ بھی جانے ہے لہو رو کے لکھا ہی مکتوب
ہم نے سرنامہ کیا کاغذِ افشانی کا

غالب ابھی تیرہ یا چودہ برس کے تھے جب میر کا انتقال ہو گیا گویا میر نے شاعری میں غالب سے تقریباً پچاس برس پہلے کی زبان استعمال کی ہے۔ پچاس برس میں زبان نے جو ارتقائی منازل طے کیے اکثر اشعار میں مضامین کی یکسانی کے باوجود ہی اسالیب کے تفاوت کا باعث ہیں۔

لیکن غالب ہی پر کیا موقوف کس بڑے سے بڑے پرانے اور نئے شاعر نے میر ایسے مینارۂ نور سے اخذِ نور نہیں کیا اور اپنے شعر کا رنگ محل اسکے شعر کی بنیاد پر استوار نہیں کیا۔

مثال کے طور پر میر کا شعر ہے :۔

رات ساری تو کٹی سنتے پریشاں گوئی
میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

اور سودا کہتے ہیں :۔

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
ہونے کو سحر آئی ہے ظالم کہیں مر بھی

اسی طرح میر کا شعر ہے :-

سرہانے میر کے آہستہ بولو!
ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے

اور سودا کہتے ہیں :-

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت
خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

لیکن میر اور سودا چونکہ ہم عصر تھے اس لئے دعوے سے نہیں کہا جا سکتا کہ سودا ہی نے میر سے استفادہ کیا لیکن میر کے بعد کے جن شاعروں نے میر کے گلدستۂ اشعار سے خوشہ چینی کی ہے۔ ان کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

جیسے میر کا شعر ہے :-

کعبہ میں جاں بلب تھے ہم دوریٔ بتاں سے
آئے ہیں پھر کے یارو اب کی خدا کے ہاں سے

ذوق نے اسی مضمون کو بنیاد بنا کر شعر کو شیخ سے متعلق کر دیا۔

گر اب کی پھرے جیتے وہ کعبہ کے سفر سے
تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے

میر کا شعر ہے :-

کیا کیا لکھا ہے ہیں نے وہ میر کیا کہے گا!
گم ہووے نامہ بر سے یارب مری کتابت

ذوق نے اس مضمون کو زیادہ شائستگی بخشتے ہوئے کہا :-

خط لکھ کے اور بھی ہیں پڑا پیچ و تاب میں
کیا جانے لکھ دیا اُسے کیا اضطراب میں

یا میر کا شعر ہے :-

فلک کا مُنہ نہیں اس فتنہ کے اُٹھانے کا
ستم شریک ترا یار ہے زمانے کا

مومن نے اسی مطلع سے اپنا مطلع کہنے کی کامیاب کوشش کی :-

ہزار لطف ہیں جو ہر ستم میں جاں کے لئے
ستم شریک ہوا کون آسماں کے لئے

لیکن میر کے اس کربناک شعر کو :-

ارمان ہے ہتھوں کو وے اب کریں محبت
ہم تو ہوئے پشیماں دل کے تئیں لگا کر

مومن نے جب اپنے لفظوں میں منتقل کرنے کی کوشش کی تو کرب
میں وہ شدّت نہ رہی :-

ایک ہم ہیں جو ہوئے ایسے پشیمان کہ بس!
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

اسی غزل میں مومن کا یہ شعر جو خاص طور پر مشہور ہے۔

ہم نکالیں گے سُن اے موجِ صبا بل تیرے
اُس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

درحقیقت میر کے ان دو شعروں سے عبارت ہے:۔

آوے گی اک بلا تیرے سر سُن لے اے صبا
زلفِ سیہ کا اس کے اگر تار جائے گا

اور:۔

آئی ہی بوجھیو تو بلا اپنے سر صبا
وے مشک فام زلفیں پریشاں ہوئیں اگر

ویسے حافظ الٰہی بخش شائق نے بھی اسی مضمون کو اپنے یہاں اس انداز سے نظم کیا ہے:۔

سن لے اے بادِ صبا اور پریشاں ہو گی
زلفِ جاناں کا اگر بال بھی بانکا ہو گا

میر کا شعر ہے:۔

سب ہوئے نادم پئے تدبیر ہو جانا سمیت
تیر تو نکلا مرے سینے سے لیکن جاں سمیت

اور شیفتہ نے اس مضمون کو اس طرح اپنا لیا :-

اے ستم گر رگِ جاں میں ہے مرے پیوستہ
دم نکل جائے گا سینے سے مرے تیر نہ کھینچ

آتش ایسے مرصّع ساز فن کار نے بھی اپنے بعض شعروں میں
بنیادی طور پر میرؔ کے مضمون ہی کو لے کر اس میں نگینے جڑے ہیں۔
جیسے میرؔ کہتے ہیں :-

عجب صحبت ہے کیونکر صبح اپنی شام کریئے اب
جہاں ٹک آن بیٹھے ہم کہا آرام کریئے اب

اور آتشؔ کا شعر ہے :-

جب میں جاتا ہوں تو منہ پھیر کے یوں کہتے ہیں
نیند آئی ہے ہمیں آپ بھی آرام کریں

یا میرؔ کا شعر ہے :-

کاسۂ چشم لے کے جوں نرگس
ہم نے دیدار کی گدائی کی

اور آتشؔ کہتے ہیں :-

آنکھیں نہیں ہیں چہرے پہ تیرے فقیر کے
دو ٹھیکرے ہیں بھیک کے دیدار کیلئے

اس مقام پر مجھے بے اختیار سید برکت علی پیمی بلگرامی کے ایک دوہے کا خیال آرہا ہے :-

چکھیچ جوگی کنٹھاگرین اروِن سیام ارو سویت
آنسو بوند سمرن میں درشن بھکچھا ہیت

جس کا ترجمہ میں نے اردو قطعہ میں اس طرح کیا ہے :-

اُجلے سُرخ اور سیہ لبادوں میں
میری آنکھیں بھی ہیں کوئی جوگی
تیرے جلووں کی بھیک چاہتی ہیں
لے کے مالائیں اپنے اشکوں کی

میر کا بہت مشہور شعر ہے :-

عہدِ جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

اور آتش کہتے ہیں :-

پیری میں آئی موت جوانی گزر گئی
جاگا تمام شب میں دمِ صبح سو گیا

آتش نے مضمون کو تو اپنا لیا لیکن جو بے ساختگی اور برجستگی میر کے شعر میں ہے وہ آتش کے نسبتاً بوجھل اور پُر تکلف

اسلوب میں نہ سما سکی۔

میرؔ کہتے ہیں :۔

بوئے کبابِ سوختہ آئی دماغ میں
شاید جگر کو آتشِ غم نے جلا دیا

اور بہادر شاہ ظفرؔ نے اس مضمون کو دوسری بحر میں منتقل کرتے ہوئے "بوئے کبابِ سوختہ" اور "آتشِ غم" کی تراکیب بھی جوں کی توں اپنا لیں :۔

خدا جانے کیا کیا حالِ دل کا آتشِ غم نے
کہ ہے بوئے کبابِ سوختہ ہر آہِ سوزاں میں

میرؔ کا شعر ہے :۔

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میرؔ
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

مصحفیؔ نے تو محض اس شعر کے اسلوب میں ایک نیا مضمون ادا کیا :۔

مصحفیؔ ہم نے تو سوچا تھا کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

لیکن سجادؔ نے میرؔ کے مضمون کو بھی بہت ہلکے انداز میں

اپنانے کی کوشش کی :-

میں نے جانا تھا قلم بند کرے گا دو حرف
شوق کے لکھنے کا سجاد نے دفتر کھولا

داغ دہلوی نے اپنے اس مطلع کو بھی :-

صبر لے زاہد نا فہم نہ مے خواروں کا
بخشنے والا بھی دیکھا ہے گنہگاروں کا

میر کے اس شعر سے تراشا ہے :-

تمہیں تو زہد و ورع پر بہت ہے اپنے غرور
خدا ہے شیخ جی ہم بھی گناہ گاروں کا!

میر کا شعر ہے :-

دل خراشی و جگر چاکی و خوں افشانی
ہوں تو ناکام پہ رہتے ہیں بہت کام مجھے

اور امیر مینائی نے جس کا دعوےٰ ہے کہ :-

دُزدِ سخن سے معنیٔ رنگیں کو کیا خطر
مہندی لگائے گا کوئی کیونکر لگی ہوئی

لگی ہوئی مہندی اس طرح لگانے کی کوشش کی

رات دن رونا۔ تڑپنا، تلملانا، پیٹنا
ہیں تو ہم ناکام پر رہتا ہے کاموں کا ہجوم
ایسے ہی میرؔ کے اس شعر کے مضمون کو
ہم نے یہ مانا کہ واعظ ہے ملک
آدمی ہونا بہت مشکل ہے یاں
بیان یزدانی میرٹھی نے بھی محض دوسری بحر میں تبدیل کر دیا :-

اے بیاںؔ سہل ہے ہم رنگِ ملائک ہونا
آدمی بنتا ہے انسان بڑی مشکل سے

میرؔ کا شعر ہے :-

کیا کہوں میں میرؔ اپنی سرگزشت
ابتدا ہی قصّے میں وہ سو گیا

اس مضمون پر اردو کے اکثر شاعروں کا جی للچایا ہے۔ اس دور کے شعرا میں جوشؔ ملیح آبادی نے اسے اس طرح اپنایا ہے :-

آپ کو نیند آئی جاتی ہے
ختم ابھی دل کی واردات نہیں

اور مانی جائسی نے اس انداز سے نظم کیا ہے :-

جائیے دیر ہوئی آپ کو سونا ہے ابھی
دل کا رونا تو بہت کچھ مجھے رونا ہے ابھی

اِس دور کے شعرا کا ذکر آ گیا ہے تو فراقؔ گورکھپوری کا بھی ایک شعر سنیئے :-

میرے سکوتِ یاس پہ اتنا نہ ہو ملول
مجھ کو خدانخواستہ تجھ سے گلہ نہیں

اور فراقؔ گورکھپوری کا یہ مشہور بھی میرؔ تقی میرؔ کی اسی قافیہ اور ردیف لیکن دوسری بحر کی غزل کے اس شعر کا نہایت واضح اور غیر مبہم عکس ہے۔

شکوہ کروں ہوں بخت کا اتنے غضب ہو نہاں
مجھ کو خدانخواستہ تم سے تو کچھ گلہ نہیں

ساحرؔ لدھیانوی اُردو کے نہایت نامور اور جدید نظم گو شاعر ہیں لیکن اپنی شاعری کے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے کبھی کبھار غزل بھی کہہ لیتے ہیں اگرچہ ان کے اندازِ تغزل پر بھی نظمیت کی گہری چھاپ ہوتی ہے لیکن اپنے اس شعر ہیں :-

اس طرف سے گزرے تھے قافلے بہاروں کے
آج تک دہکتے ہیں زخم رہگزاروں کے

وہ بھی غیر ارادی طور پر میر کے اس شعر سے استفادہ کرنے
پر مجبور ہو گئے ہیں :-

جہاں اب خارزاریں ہو گئی ہیں
وہاں اکثر بہاریں ہو گئی ہیں

اُردو کے پرانے شاعروں میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ملے جس
[illegible] اگر اکثر نہیں تو متعدد اشعار کی پھلواری کو پہلے سے کہے ہوئے
[illegible] اشعار کے آب و رنگ سے نہ سینچا ہو۔ نہایت نامور
[illegible] صاحب طرز اردو شعرا نے فن شعر کی تحصیل فارسی شعرا سے
[illegible] فارسی شاعری اُردو شاعری کی جنم ماتا ہے۔ یہ دوسری بات
[illegible] بچی جب جوان ہوئی تو اُس کے خط و خال کی تابانی
[illegible] ان کے حسن و جمال کے لئے بھی باعث رشک ہو گئی
[illegible] شاعری کا آغاز فارسی کی تقلید ہی کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ
[illegible] شاعروں نے فارسی اشعار کے بکثرت ترجمے کئے ہیں۔

بروزِ ہجر مرا دیدہ بس گہر بار است
شبے کہ ماہ نباشد ستارہ بسیار است

(قاسم کاہیؔ)

پی بن مجھ آنسوؤں کے شراروں کی کیا کمی
جس رات مہ نہیں ہے ستاروں کی کیا کمی

(سراج دکنیؔ)

آلودہ ز قطراتِ عرق دیدہ جبیں را
اختر ز فلک می نگرد روئے زمیں را

(محمد جان قدسیؔ)

آلودۂ قطراتِ عرق دیکھ جبیں کو!
اختر پڑے جھانکے ہیں فلک پر سے زمیں کو

(سوداؔ)

درآں دیار بہ سودا روود دلم کہ دہند
جوئے ملال بہ عمرِ ابد بہ بسیاری!

(عرفیؔ)

اہلِ بازارِ محبت کا بھی کیا سودا ہے
عشرتِ عمرِ ابد قیمتِ غم دیتے ہیں

(مومنؔ)

نگہ۔ از گوشۂ چشمش چناں مستانہ مے آید
کہ تر سا زادۂ بدمست از میخانہ مے آید

(شیخ علی حزیں)

یوں نگہہ نکلے ہے چشم یار سے
مست جیسے خانۂ خمار سے

(ذوق)

در فراق تو جہاں اے بت محبوب کنم
صبر ایوب کنم، گریۂ یعقوب کنم

(مخلص کاشی)

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا
صبر ایوب کیا، گریۂ یعقوب کیا

(ذوق)

بہار عمر ملاقات دوست دوراں است
چہ حظ برد خضر از عمر جاوداں تنہا

(صائب)

عزیزوں ہی کی صحبت سے تو جینے کی بہار
ورنہ کیا فائدہ ہے خضر سا تنہا رہنا

(نہال چند لاہوری)

ہے

حضرتِ خضر بنے رہ کے جو تنہا کیا لطف
زندگی وہ ہے جو ہو جائے بسر یاروں میں

(فضل علی خان فضل)

ہم جو یاروں میں نہ بیٹھیں تو ہمیں صبر آ جائے
حضرتِ خضر کو کیا زیست کی لذت ہوگی

(ذوق)

بے لطف بسر کرتے ہیں یہ خضر و مسیحا!
کچھ لطف نہیں زیست کا بے صحبتِ احباب

(شیخ امام علی سحر)

بودیم ہمچو نافہ ہمہ عمر در خطا
موئے سفید بیں و درونِ سیاہ را

(کاتبی)

نافے کی طرح عمر خطا میں گزر رہی
بالوں پہ سفیدی ہے سیاہی دل میں

(انیس)

مسی آلودہ بر لب رنگِ پان است
تماشا کن کہ آتش در دخان است (بیدل)

مسی آلودہ لب پر رنگِ پاں ہے
تماشا ہے تہِ آتش دھواں ہے

(ناسخ)

کریماں را بدست اندر درم نیست
خداوندانِ نعمت را کرم نیست

(سعدی)

جو سخی ہیں مالِ دنیا سے ہیں خالی ان کے ہاتھ
اہلِ دولت جو ہیں وہ دستِ کرم رکھتے ہیں

(انیس)

بروزِ بیکسی کس نیست غیر از سایہ یارِ من
مگر آنہم نہ دارد طاقتِ شبہائے تارِ من

(ناصر علی)

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

(ناسخ)

کردم ہمہ مشکلاتِ عالم را حل
ہر بند کشودہ شد مگر بندِ اجل

(بو علی سینا)

عقدے سب حل ہوئے مگر آہ انیس
یہ بندِ اجل کسی سے کھولا نہ گیا

(انیس)

حمدِ بے حد مر خدائے پاک را
آنکہ ایماں داد مشتِ خاک را

(شیخ فریدالدین عطار)

حمدِ بے حد اس خدائے پاک کو
نورِ ایماں جس نے بخشا خاک کو

(غلام امام شہید)

دیدہ ام دفترِ پیمانِ وفا حرف بحرف
نامِ خوباں ہمہ ثبت است مگر نامِ تو نیست

(نظیری)

فہرست میں خوبانِ وفادار کے پیارے
دیکھا تو کہیں اس میں ترا نام نہ پایا!

(قائم)

سناں بر سناں رستہ چو نوکِ خار
سپر بر سپر بستہ چوں لالہ زار

(نظامی)

ہر سمت تھی سناں پہ سناں مثلِ خار زار
ہر صف میں تھی سپر پہ سپر مثلِ لالہ زار

(انیس)

گویند کہ شب بر سرِ بیمار گران است
گر سرمہ بچشم تو گران است ازان است

(ناصر علی)

ناتوانی سے گراں سرمہ ہے چشمِ یار کو!
جس طرح ہو رات بھاری مردمِ بیمار کو

(ناسخ)

کج را بہ تکلف نتواں راست نمودن
کے تیر تواں ساختن از شاخِ کمانہا

(محمد طاہر غنی)

راست ہوتے ہیں کسی سے بھی کہیں کج طینت
تیر ہوتی ہے کہیں شاخِ کماں سنتے ہو

(قائم الدین قائم)

~~~~~

ترا حیا و مرا آبِ دیدہ شد غمّاز
وگرنہ عاشق و معشوق راز ہا دارند

(حافظ)
~~~~~

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

(حالی)

بوریا جائے من و جائے تونگر قالیں
شیرِ قالیں دگر و شیرِ نیستاں دگر است

(حزیں)

فرق ہے شاہ و گدا میں قولِ شاعر ہے یہی
شیرِ قالیں اور ہے شیرِ نیستاں اور ہے

(ناسخ)

حیف در دے کہ بخود ننگِ مداوا بر داشت
بہر جانے نتواں نازِ مسیحا بر داشت

(جانِ جاناں)

منتِ حضرتِ عیسےٰ نہ اٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہوں گے

(مومن)

ایں سخن از پیرِ کنعانم بہ خاطر ماندہ است
دیدنِ روئے عزیزاں چشم روشن می کند

(ظفر خاں احسن)

سپیدی چشم کی زائل ہو دیدارِ عزیزاں سے
اڑایا ہم نے یہ نسخہ بیاضِ پیرِ کنعاں سے

(شہیدی)

کبوتر نامہ ام بردو نشد معلوم حالِ او
مگر در رہ ز سوزِ نامۂ من سوخت بالِ او

(صبوحی چغتائی)

لکھا تھا خط میں انہیں حالِ آہِ سوزاں کا
سنا ہے راہ میں بجلی گری کبوتر پر

(تعشق لکھنوی)

از تو دلِ مہر و وفا می خواہد
سادگی بیں کہ چہا می خواہد

(مرزا علی بیگ تسلیم)

وفا تجھ سے اے بے وفا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

(حسرت موہانی)

گرچہ خردیم نسبتے است بزرگ
ذرۂ آفتابِ تابانیم

(ظہوری)

پہلے اک ذرۂ ذلیل تھا میں
تیری نسبت سے آفتاب ہوا

(حسرت موہانی)

خواب دیدم کہ ترا دست بدامن زدہ ام
در گریبان خودم بود چو بیدار شوم

(ملک قمی)

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

(اصغر گونڈوی)

اور میر تقی میر جیسے پُرگو شاعر کی کلیات میں تو اکثر اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں وہ ایرانیوں کے ذہن سے سوچتے ہیں۔ ایسے اشعار بھی یا تو فارسی شعروں کے تراجم ہیں یا ان سے ماخوذ ہیں۔ جیسے :-

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

(حافظ)

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

(میر)

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

(جامی)

سیّد ہو یا چمار ہو اس جا وفا ہے شرط!
کب عاشقی میں پوچھتے ہیں ذات کے تئیں

(میر)

گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم
چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

(سعدی)

کہتے تھے کہ یوں کہتے یوں کہتے اگر آتا
سب کہنے کی باتیں تھیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

(میر)

بوئے یارِ من ازیں سست وفا می آید
گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

(نظیری)

سحر پائے گل بے خودی ہم کو آئی
کہ اس سست پیماں میں بو تھی کسو کی

(میر)

اسی مضمون میں تصرف کے ساتھ سوداؔ نے تو انتہائی بلند شعر کہا ہے :-

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اوّل بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

(سعدی)

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گنہ
ان سے بھی تو پوچھئے تم اتنے پیارے کیوں ہوئے

(میرؔ)

بر دوشِ غیر دست نہاد از رہِ کرم
مارا چو دید لغزشِ پا را بہانہ ساخت

(قتیلؔ)

بے ہوش دیکھ آ گئے مرے ساتھ غیر کے
رکھتا ہے پاؤں مست ہو جیسے شراب کا

(میرؔ)

تو بخویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیریؔ
بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

(نظیریؔ)

صرفہ نہیں ہے مطلق جانِ عزیز کا بھی
اے میرؔ تجھ سے ظالم ہے احتراز واجب

(میرؔ)

حدیثِ چتر مرصّع بمیرِ قافلہ گوئے
کہ سایہ دارِ عزیزاں ہمایں مغیلاں است

(جامیؔ)

کام کیا بالِ ہما سے چترِ شہ سے کیا غرض
سر پہ اک دیوار ہی کا اس کی سایا چاہیئے

(میر)

عاشق ہم از اسلام خرابات ہم از کفر
پروانہ چراغِ حرم و دیر ندانند

(عرفی)

کس کو کہتے ہیں نہیں میں جانتا اسلام و کفر
دیر ہو یا کعبہ مطلب مجھ کو تیرے در سے ہے

(میر)

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم!
کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جاں ایں جاست

(نظیری)

جس جائے سراپا پہ نظر جاتی ہے اس کے
آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر کر

(میر)

مکن تکیہ بر ملکِ دنیا و پشت،
کہ بسیار کس چوں تو پرورد کشت

(سعدی)

زنہار نہ جا پرورشِ دورِ زماں پر
مرنے کے لئے لوگوں کو تیار کرے ہے

(میرؔ)

ہر بلائے کز آسماں آید گرچہ بر دیگراں قضا باشد
بر زمیں نا رسیدہ می پرسد، خانۂ انوری کجا باشد

(انوریؔ)

اوّل زمینیوں میں ہو نازل مری طرف
جو حادثہ نزول کرے آسماں سے

(میرؔ)

مرزا غالبؔ تو بنیادی طور پر اپنے آپ کو شاعر ہی فارسی زبان کا سمجھتے تھے اور ان کے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ان کی فارسی شاعری ہی ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کی صحیح طور پر ترجمانی کرتی ہے۔

پارسی ہیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

لیکن ان کے بعض اردو اشعار بھی دوسرے اردو شاعروں کی طرح فارسی اشعار سے ماخوذ ہیں لیکن اپنے پیش رو اور ہم عصر شعراء کی طرح انہوں نے فارسی اشعار کا لفظ بلفظ ترجمہ بہت کم کیا ہے۔

بوئے گل، نالۂ دل۔ دودِ چراغِ محفل
ہر کہ از بزمِ تو برخاست پریشاں برخاست

(بیدل)

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

(غالب)

تو شدا روئے محبت رامپرس اجزا کہ چیست
سودۂ الماس در زہرِ ہلاہل مے کنند

(فیضی)

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

(غالب)

جیسی ایک دو مثالوں سے قطع نظر غالب کی طبّاعی بالعموم وہاں بھی کارفرما رہتی ہے جہاں وہ فارسی اشعار کو اپنے اردو شعروں میں منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لفظی ترجمہ کرنے کی بجائے وہ شعر کے بنیادی میلان کا ترجمہ کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے محبوب شاعر بیدل کا ایک شعر ہے۔

میردم از خویش و در اندیشہ باز آمدن
ہیچو عمرِ رفتہ یارب برنہ گردانی مرا

یعنی میں اپنے آپ سے گزرا جاتا ہوں اور ڈر رہا ہوں کہ کہیں پھر اپنے آپ میں نہ آجاؤں۔ اس لیے اے خدا تو جس طرح میری عمرِ رفتہ کو واپس نہیں لائے گا اسی طرح مجھے بھی اپنے آپ میں واپس نہ لے جانا۔ یہ ترجمہ ایک شعر میں نہیں سما سکتا لیکن غالب نے اس شعر کے مفہوم کی روح کو نہایت مستانہ انداز سے اپنے اردو شعر کے قالب میں یوں اتارا ہے :-

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

یا بیدل ہی کی دو مختلف غزلوں کے شعر ہیں :-

سازِ ہستی غیرِ آہنگِ عدم چیزے نداشت
ہر نوائے راکہ وادیدم خموشی مے سرود

اور :-

مطلبم از مے پرستی تر دماغی ہا نبود !
یک دو ساغر آب دادم گریۂ مستانہ را

مرزا غالب نے ان دونوں شعروں کو نئے رنگ و آہنگ کے

ساتھ اُردو کا لباس پہناتے ہوئے بالترتیب دو مختلف شعر یوں کہے ہیں :-

نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیئے

اور :-

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

یا رائم مشہدی کا شعر ہے :-

ہے کند وعدۂ دیدار بفردا امروز
یار دانستہ کہ امروزِ مرا فردا نیست

اور غالبؔ نے نواب زین العابدین خاں عارفؔ کی موت پر جو غزل بطورِ مرثیہ کہی اس کا ایک شعر ہے :-

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا بھی ہوگا کوئی دن اور

مشہدی کے شعر میں "قیامت" اور غالبؔ کے یہاں امروز کے الفاظ اگرچہ موجود نہیں لیکن دونوں اشعار کی معنوی فضا میں کوئی فرق نہیں ہے -

غالب اپنے ایسے اشعار ہیں جن کا سرچشمہ فارسی اشعار ہیں۔
فارسی اشعار کے محض بنیادی میلان ہی کو منتقل نہیں کرتے بلکہ اکثر اوقات
شعر کے لطیف و نازک اجزائے معنوی و لفظی سے اہم ترین جزو
مستعار لے کر باقی اجزا ہیں خود اپنی طرف سے اضافہ کرنے کے
بعد شعر کو مکمل کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض فارسی اشعار کے
مضامین انھوں نے اپنے دلکش اسلوب اور مخصوص طرز میں ادا
کرنے کے بعد بلند تر کر دیئے ہیں اور ان میں معنوی وسعت
پیدا کر دی ہے اور ایسے اشعار سے بھی ان کی حیرت انگیز فنی
سوجھ بوجھ اور ان کا غیر معمولی تخلیقی جوہر مترشح ہے۔
مثلاً عرفی کا شعر ہے :-

چشم نہ بہرِ خویش دمِ نزع تر شود
ترسم کہ من بمیرم و غم دربدر شود

اور غالب نے اس مضمون میں یوں رنگ آمیزی کی ہے
کہ :-

آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

یا بیگی دختر علی حیدر کا شعر ہے :-

من اگر توبہ زمے کردہ ام اے سرو سہی
توخود ایں توبہ نہ کردی کہ مرا مے نہ دہی

غالب نے اس مفہوم کو اور زیادہ وسعت دے کر اپنے پہلو دار انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ :-

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

بیگی کے شعر میں معنویت کے اتنے پہلو نہیں ہیں جتنے غالب کے شعر میں ہیں۔

یا فارسی کے کسی شاعر کا شعر ہے :-

زضعف تن عجب حال است بیمار محبت را
کہ نتوانا کشید از ناتوانی بار صحت را

اس مضمون کو غالب اور غالب کے ہم عصر مومن دونوں نے خوش اسلوبی کے ساتھ اپنایا ہے۔

مومن کہتے ہیں :-

اب تو مر جانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو
ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اٹھا جائے ہے

اور غالب کا شعر ہے :-

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

لیکن غالبؔ اور مومنؔ دونوں نے اکتساب کرتے ہوئے اس امر کو ملحوظ رکھا ہے کہ خیال و مضمون کے اتحاد کے باوجود اندازِ بیاں اور ترکیب شعری میں نمایاں فرق ضرور باقی رہے۔ اندازِ بیاں اور ترکیبِ شعری کی وضاحت کے لئے چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں جامیؔ کا شعر ہے۔

گفتی شبے بخوابِ تو آیم ولے چہ سود
چوں من بعمرِ خویش ندیدم کہ خواب چیست

اور غالبؔ نے محبوب کی زبان سے کچھ کہلوانے کی بجائے خود ہی یہ فرض کرلیا۔

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے طپشِ دل مجالِ خواب تو دے

یا آذری طوسی اسفرائنی کا شعر ہے:۔

جانے کہ داشت کرد خدائے تو آذری
شرمندہ از تو گشت کہ جانِ دگر نداشت

اور غالبؔ نے اسی بات کو زیادہ سادہ اور موثر پیرائے میں

اس انداز سے کہا ہے :-

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

دونوں شعروں کا حاصل یہی ہے کہ اگر دوسری جان ہوتی تو اسے بھی نثار کرکے محبت کا حق ادا کرتے ۔

وقوعی تبریزی کا شعر ہے ۔

می نماید کہ سرِ عہد شکستن داری
خشمِ ایں بار تو چوں رنجش ہر بار تو نیست

غالب نے اسی مضمون کو اختصار سے نظم کرتے ہوئے اپنے مخصوص اندازِ بیاں کی وجہ سے اس میں زیادہ زور اور تاثر پیدا کر دیا ۔

بار ہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں
لیکن اب کے سرگرانی اور ہے

یا نظیری کا شعر ہے :-

نشاطِ رفتہ ز دوراں بہ صبر بستانم
کہ ہر معاملہ آزردہ از تقاضا نیست

اور غالب کہتے ہیں :-

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

مرزا کے ایسے تمام اشعار جو اساسی طور پر فارسی اشعار کی پیداوار ہیں اس حقیقت کا بیّن ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ مرزا مضمون میں اضافہ کرنے اور مضمون سے مضمون پیدا کرنے کے فن میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

مثلاً عرفی شیرازی کا شعر ہے :-

ہرکس نہ شناسندۂ راز است و گرنہ ایں ہا ہمہ راز است کہ معلومِ عوام است

غالب نے مصرعۂ اولیٰ کو معمولی سی ترمیم کے ساتھ اپناتے ہوئے اپنے شعر کے دوسرے مصرعے میں پردے کو ساز کا پردہ کہہ کر حسنِ خیال کی انتہا کر دی۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

عرفی ہی کا ایک اور شعر ہے :-

کے لازم است بادہ کشیدن ز جامِ زر
مقصودِ تو گر انیست قصورِ سفال چیست

غالب نے جب یہی مضمون نظم کیا تو اس سے کہیں زیادہ زوردار

شعر کہہ دیا :-

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

اسی طرح عرفی ہی کے اس مطلع سے :-

بیار بادہ کہ جانم دمے زنالہ بر آید
ہزار زمزمہ از دل بیک پیالہ بر آید

غالب نے اپنے اس سدا بہار شعر کو تخلیق کر لیا ۔

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبا مرے آگے

آصفی شیرازی کا شعر ہے :-

تو ہم در آئینہ حیراں زحسنِ خویشتنی
زمانہ ایست کہ ہر کس بخود گرفتار الیست

غالب نے اس مضمون میں اضافہ کرنے کے بعد غم و الم میں زانو کو اپنا مونس بناتے ہوئے کہا ۔

شکوہ سنجِ رشکِ ہم دیگر نہ رہنا چاہیئے
میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

دونوں اپنے اپنے حال میں مبتلا ہیں ۔ دونوں کا ایک ایک

ہمدرد ہے۔ ایک دوسرے سے کوئی کیا شکوہ کرسکتا ہے۔
میرا مونس زانو ہے اور تیرا آشنا آئینہ۔

فریدوں خراسانی کا شعر ہے۔

از ضعفِ دل منال فریدوں زبے کسی
میدار دلِ قوی کہ کسِ بے کساں خداست

اور غالب کہتے ہیں:۔

بے دل نہ ہو بیگانگیِ خلق سے غالب
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

مضمون ایک ہے لیکن غالب نے ضعفِ دل کی بجائے
بے گانگیِ خلق کہہ کر اپنے شعر میں زیادہ وسعت پیدا کرلی۔

ذوقی سمرقندی کا شعر ہے:۔

مکن تغافل ازیں بیشتر کہ می ترسم
گماں برند کہ ایں بندۂ بے خداوند است

لیکن غالب نے محبوب کے تغافل کی بجائے پوری زندگی
کی مصیبتوں کی طرف اشارا کرتے ہوئے یہی بات اس ڈھنگ
سے کہہ دی:۔

زندگی اپنی جو اس طور پہ گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ثباتؔ کہتا ہے :-

با آنکہ ہمہ عمر نہ رفتیم زدرِ او
پُرسد زمن از ناز ترا خانہ کدام است

اور غالبؔ کا شعر ہے :-

تو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

شمسؔ تبریز کا شعر ہے :-

در شرابم چیزِ دیگر ریختی
بادہ تنہا نیست ایں آمیختی

غالبؔ نے مصرعۂ ثانی تو کم و بیش وہی رکھا جو شمسؔ تبریز کا ہے لیکن اپنے شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں وہ کیفیت پیدا کردی جس کی وجہ سے دونوں شعروں میں عجیب و غریب اور پُر لطف فرق پیدا ہو گیا۔ غالبؔ کا شعر ہے :-

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

رضی سمرقندی کا مطلع ہے :-

ستارہ ایست درِ گوشِ آں ہلال ابرو
زروئے حسن بہ خورشید مے زند پہلو

"میزند پہلو" کا ترجمہ شعر تو کیا نثر میں بھی نہیں ہو سکتا
صائب ایسا قادر الکلام شاعر بھی اس محاورے کو اس خوش
اسلوبی سے نظم نہیں کر سکا۔

زند پہلو بہ گردوں کوہِ عصیانے کہ من دارم
بصد دریا نہ گردد پاک داما نے کہ من دارم

لیکن اس مضمون کو اپنے مرغوب موضوع رشک سے متعلق
کرتے ہوئے ٹبندے کے اس موتی کو جسے رضیؔ نے ستارہ
بنا کر خورشید سے بھی بلند کر دیا۔ غالبؔ نے گلے کی چمپا کلی میں
گوہر فروش کا کوکبِ طالع ظاہر کرتے ہوئے کہا :-

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر شناس ہے

رضیؔ نے "دُرِ گوش" کہہ کر اگر سامعہ کو نور پہنچایا ہے
تو غالبؔ نے "عقدِ گردن" سے آنکھوں کو منوّر کیا ہے۔
طالب آملی کا شعر ہے :-

اے گوش رغیتیم کہ احول شدی چو چشم
تا ہر چہ گفتی از تو مکرر شنید مے

غالب نے اس مضمون میں تصرف کرتے ہوئے جو شعر کہا ہے اس میں مصرعۂ ثانی متحد اور مصرعۂ اولیٰ مختلف ہے۔ طالب کی آرزو ہے کہ میرے کان احول ہوتے جس طرح بعض لوگوں کی آنکھیں احول ہوتی ہیں۔ احول چشم ایک چیز کو دو دیکھتا ہے تاکہ جو کچھ معشوق کہتا ہیں دوبارہ سنتا اور لذت سماعت مکرر حاصل ہوتی اور غالب اپنے شعر میں معشوق کی بات کو دوبارہ سننے کے لئے بہرہ بن گئے ہیں۔ مذاق کے اختلاف و امتیاز کے باوجود دونوں اپنے اپنے معشوق کی ہر بات کو ایک بار پھر سننا چاہتے ہیں۔

غالب کا شعر ہے :-

بہرہ ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

اور یہ واقعہ ہے کہ طالب کے شعر کی نسبت غالب کے شعر میں مضمون کی شوخی زیادہ گہری ہے۔ غالب کی شوخیٔ طبع تو ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے۔ اپنی اسی شوخی کی وجہ سے انہوں

نے بعض ایسے اشعار جو فارسی شعروں سے اخذ کئے زیادہ دلآویز بنا لئے۔

جیسے :-

ہم از وفا مدار امید وعدۂ کہ من
از ذوقِ وعدۂ تو بفردا نمی رسم

(میلی)

ترے وعدہ پہ جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

(غالب)

خوش دلم زیں کہ باو نامہ نویسم شب و روز
مقصدم نیست کہ مکتوب رسد یا نرسد

(حسن بیگ رفیع)

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

(غالب)

بہ او چو میرسم آسودہ می شوم از دور
ندیدہ حال مرا وقتِ بے قراری حیف (فسونی)

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

(غالبؔ)

ہست صد منت بجاں از غیبتِ بدگو مرا
چوں بایں تقریبِ من آرد بیادِ او مرا

(شرف قزوینی)

گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے بایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

(غالبؔ)

نہ صرف ایرانی شعرا ہی کے کلام کا ترجمہ کیا ہے یا ان کے اشعار کو بنیاد بنا کر شعر کہے ہیں بلکہ اردو شاعروں نے تو ہندوستان کے فارسی شعرا کا کلام بھی اُردو میں منتقل کر دیا ہے۔ غالبؔ کے کلام سے بھی اس دعوے کے ثبوت فراہم کئے جا سکتے ہیں۔

جیسے امیر خسرو کا شعر ہے :۔

گفتم چگونہ مے کشی و زندہ مے کنی
از یک نگاہ کشت و نگاہِ دگر نہ کرد

اور غالبؔ کہتے ہیں :۔

کرنے گئے تھے اس کے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

یا خواجہ میر دردؔ کہتے ہیں :۔

بہ ہیچ کارِ کتب خوانیت نمی آید
ز جمعِ خاطرِ خود نسخۂ فراہم کن

اور مرزا غالبؔ کا شعر ہے :۔

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

یا گم گو کاشمیری کا مطلع ہے :۔

ز خضر عمر فزوں است عشق بازاں را
اگر ز عمر شمارند روزِ ہجراں را

اور مرزا غالبؔ نے گم گو کا مصرعۂ ثانی تقریباً اپنا کر لیکن گم گو کی طرح طولِ عمر کے لئے خضر کو پیش کرنے کی بجائے اجمال سے محاکات کا رنگ پیدا کرتے ہوئے ایسا لاجواب مطلع کہا جس میں گم گو کے مطلع کی طرح ایطا کا سقم بھی نہیں۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

اور اسی طرح بعد میں غالبؔ کے فارسی اشعار بھی اردو شاعروں نے اپنا لیئے۔

جیسے :-

بے خود بوقتِ ذبح تپیدن گناہِ من
دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہِ کیست

(غالبؔ)

تڑپا ہیں وقت ذبح تو مجھ سے خطا ہوئی
خنجر کیا نہ تیز یہ کس کا قصور تھا

(امیر مینائی)

آشنا با نہ کشد خارِ رہت دامنِ ما
گوئی ایں بود از یں پیش بہ پیراہنِ ما

(غالبؔ)

نظر سے ان کی پہلی ہی نظر یوں مل گئی اپنی
کہ جیسے مدتوں سے تھی کسی سے دوستی اپنی

(جگر مراد آبادی)

مے بہ زنہار مکن عرض کہ ایں جوہرِ ناب
پیشِ ایں قوم بہ شوراۂ زمزم نرسد (غالبؔ)

زحمتِ مے زہاد کو مت دے
ان کو پلا شورابۂ زمزم

(فراقؔ گورکھپوری)

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنجِ خمار ما
چہ قیامتے کہ نمی رسی زکنارِ ما بکنارِ ما

(غالبؔ)

ہم آہنگی بھی تیری دوریٔ قربت نما نکلی!
کہ تجھ سے مل کے بھی تجھ سے ملاقاتیں نہیں ہوتیں

(فراقؔ گورکھپوری)

ہر شاعر کے کلام میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے دوسروں سے استفادہ کیا ہے لیکن باکمال شاعروں کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے استفادہ کرتے ہوئے بالعموم اصل شعر کی نسبت اپنے شعر کو اپنی انفرادیت کی طرفہ کاری سے زیادہ چمکا دیا ہے اور انفرادیت کی طرفہ کاری کا راز غزل میں زیادہ تر اسلوب ہی سے متعلق ہے معنوی اتحاد کے باوجود لب ولہجہ کا اختلاف غزل میں بڑی اہمیت رکھتا ہے وہ چیز جسے تاثر یا شدتِ احساس سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس

کے پھول بھی عموماً لب و لہجہ کی ٹہنی ہی پر کھلتے ہیں۔ بقولِ نیاز فتح پوری۔

"یوں تو شاعری کی تمام اصناف کا تعلق صرف طرزِ ادا اور اندازِ بیان سے ہے لیکن غزل کی کامیابی خصوصیت کے ساتھ اس پر منحصر ہے۔"

بعض شعرا کے خام اور ناقص اسلوب کی وجہ سے ان کی بھونڈی نقالی کو اصل شعر کا منہ چڑانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ غالباً اسی حقیقت کے پیشِ نظر عندلیب شادانی کو ایک بار اپنے دوستوں کی ایک محفل میں کہنا پڑا کہ تھوڑی سی موزونیٔ طبع اور قدرتِ بیان کے علاوہ شعر کہنے کے لئے کسی تیسری چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی بھی خیال معمولی سے تصرف کے ساتھ کسی بھی بحر اور زمین کے سانچے میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس محفل میں ایک صاحب نے غالب کا یہ شعر پیش کیا۔

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

اور اسی قافیہ اور اسی بحر میں اسی مضمون کا شعر کہنے کی

فرمائش کی تو عندلیب صاحب نے چند لمحوں تک فکر کرنے کے بعد کہا۔

پرتوِ مہر سے ذرّے میں چمک آئی ہے
سامنے تم ہو تو پیارے مرا حال اچھا ہے

ایک اور صاحب نے جب مومن کے اس شعر کا حلیہ تبدیل کرنے کے لئے کہا۔

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومنؔ
آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

تو عندلیب صاحب نے ان کی خواہش کی تکمیل یوں کی

دل کے ہر ذرّے میں آسودہ ہے اک مہرِ جمال
مشتری ہم نہ ترے اے مہِ کنعاں ہوں گے

اور پھر ایک بزرگ نے جب ناسخؔ کے اس مطلع کی صورت کو بگاڑنے کا اصرار کیا۔

مرا سینہ ہے مشرقِ آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

تو عندلیب صاحب نے کہا۔

یہ کس خورشید کے پرتو سے ہر ذرہ چمک اٹھا
کہ میرے غم کدے میں آج عالم ہے چراغاں کا

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چراغ سے چراغ تو ہر دور کے تقریباً ہر قسم کے شاعر نے جلایا ہے۔ لیکن خام کار اور تن آسان نے جب جلایا اس کی خام کاری اور تن آسانی آڑے آگئی اور اس پر سرقہ کا اطلاق ہو گیا لیکن ذہین اور مشاق فن کار نے یہ کام کچھ ایسی گھمبیرتا اور نفاست سے کیا کہ اس کے سرقہ پر بھی توارد کا گمان ہونے لگا۔ ان دونوں قسم کے شاعروں میں جو فرق ہے درحقیقت عملی طور پر وہی سرقہ اور توارد کے معنی میں ہے۔ اسی لئے میں نے شروع میں عرض کیا کہ سرقہ اور توارد میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف لب و لہجہ کا ہے۔ اگر ان میں لب و لہجہ کی خام کاری اور پختگی کا پردہ حائل نہ ہو تو عملی طور پر یہ مترادف الفاظ ہیں۔

لب و لہجہ کا انحصار لفظوں کے خاص استعمال پر ہوتا ہے۔ ہر بڑا شاعر فرسودہ الفاظ سے بھی نئی نئی معنوی کیفیتیں پیدا کر لیتا ہے اور ہر بڑے غزل گو کے چند الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن سے وہ خاص قسم کی ایمائی فضا تخلیق کرتا ہے اور انہیں الفاظ کے جادو سے پرانے سے پرانے مضمون میں بھی تازگی اور شگفتگی کی لہریں

دوہراتا ہے۔ جیسے عندلیب صاحب کے مذکورہ بالا شعروں میں لفظ "ذرّہ"

غزل میں لب و لہجہ کی اہمیت اس سے بھی ظاہر ہے کہ ہر بڑے غزل گو کا اپنا مخصوص لب و لہجہ ہوتا ہے اس بات کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس شاعر کا اپنا مخصوص اندر تھا ہوا لب و لہجہ ہو اسی کو ہم بڑا شاعر سمجھتے ہیں اور ایسا شاعر جب کسی بھی موضوع پر طبع آزمائی کرتا ہے یا کسی بھی مضمون کو اپنا لب و لہجہ عطا کرتا ہے تو اسے اپنی شخصیت کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔

مثال کے طور پر غالب اور ذوق کے کچھ ہم مضمون اشعار دیکھئے :-

مئے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجئے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

(غالب)

مئے عشرت طلب کرتے تھے ناحق آسماں سے ہم
کہ آخر جب اسے دیکھا فقط خالی سبو نکلا

(ذوق)

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

(غالبؔ)

کہتے ہیں مر جائیں گر چھٹ جائیں غم کے ہاتھ سے
پر ترے غم سے ہمیں مرنے کی بھی فرصت نہیں

(ذوقؔ)

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

(ذوقؔ)

کیا اعتبار ہستیٔ ناپائیدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

(ذوقؔ)

دونوں کا لب و لہجہ اس حد تک منفرد اور سلجھا ہوا ہے کہ ان کا فرق بخوبی اور بآسانی محسوس کیا جا سکتا ہے اور کسی ایک پر بھی سرقہ کے اطلاق کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

اسی طرح میر سوزؔ کا ایک شعر ہے :۔

کھولی گرہ جو غنچے کی تو نے تو کیا عجب
یہ دل کھُلے جو تجھ سے تو ہو اے صبا عجب

مرزا داغ نے جب اسی مضمون کو اپنا لب و لہجہ بخشا تو اس مطلع سے کہیں زیادہ شگفتہ مطلع کہہ دیا۔

دل کی کلی نہ تجھ سے کبھی اے صبا کھِلی
چمپا کِھلی، گلاب کِھلا، مونیا کھِلی

بعد میں ان دونوں شعروں سے "گرہ" اور "کلی" کو مستعار لے کر جوش ملسیانی نے اپنے خاص فصیح و بلیغ لب و لہجہ میں یہ خیال اس طرح نظم کر دیا۔

میرے ہی دل کی ہے گرہ میرے ہی دل کی ہے کلی
جو نہ کھُلی بہار میں جو نہ کِھلی بہار میں

اس دور کے غزل گو شعرا میں حسرت موہانی کے متعدد اشعار اگرچہ شعرائے قدیم کے اشعار کی صدائے بازگشت ہیں لیکن حسرت کے لب و لہجہ کی شائستگی اور گھلاوٹ نے ان کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔

مثلاً میر کا شعر ہے:-

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

حسرت نے اس مضمون کو زیادہ نکھار کر اسے اس سے زیادہ موثر پیرائے میں اس طرح ادا کیا :-

اپنا انجام بھی کچھ سوچ لیا ہے حسرت
تو نے ربط ان سے جو اس درجہ بڑھا رکھا ہے

غالب نے شوقِ پابوسی کے مضمون پر معاملہ بندی کا نہایت لاجواب شعر کہا ہے :-

دے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ ظالم بدگماں ہو جائے گا

لیکن حسرت موہانی کے گہرے عاشقانہ لب و لہجہ میں ڈھل کر یہ مضمون اور زیادہ تابناک ہو گیا۔

وہ خوابِ ناز میں تھے اور نہ تھے لے شوقِ پابوسی
نہ سمجھی پستیٔ ہمت تری اس لطفِ ایما کو

اور غالب کا یہ شعر :-

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے !
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

حسرت کے لب و لہجہ میں ڈھل کر یہ صورت اختیار کر گیا۔

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی
دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

یا غالب کے اس شعر کا مضمون :۔

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

حسرت نے اپنے شعر میں اس ڈھنگ سے باندھا۔

مل چکی ہم کو ان سے دادِ وفا
جو نہیں جانتے لگی دِل کی

یا مومن کا یہ شعر :۔

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

حسرت نے اس انداز سے اپنا لیا :۔

ہجر میں جانِ مضطرب کو سکوں
آپ کی یاد کے سوا نہ ہوا

حسرت کے علاوہ اس دور کے بعض اور غزل گو شعرا نے

بھی دوسرے شاعروں کے شعروں پر نہایت کامیابی اور ہنرمندی سے اپنے لب و لہجہ کی چھاپ لگائی ہے۔

جیسے غالبؔ کا شعر ہے:۔

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
مجھ کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

اصغرؔ گونڈوی نے اس مضمون کو اپنی شاعرانہ شخصیت سے ہم آہنگ کرنے کے بعد جو شعر کہا اس میں مضمون کی فرسودگی کے باوجود ندرت پیدا ہوگئی۔

نگہ ناز کو یہ بھی تو گوارا نہ ہوا
اک ذرا درد میں ملتی تھی جو راحت مجھ کو

یا غالبؔ کا شعر ہے:۔

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

آغا شاعر دہلوی نے اس مضمون کو اپنے شعر میں پیش کرتے ہوئے اپنے لب و لہجہ کی قوت سے اس میں زیادہ جان پیدا کر دی۔

حشر میں انصاف ہوگا بس یہی سنتے رہو
کچھ یہاں ہوتا رہے گا کچھ وہاں ہو جائے گا

غالب کا بہت مشہور شعر ہے :-

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

مصرعۂ ثانی کا تو کوئی جواب ہی نہیں لیکن فراق گورکھپوری نے اس مفہوم کو اپنے مخصوص اسلوب میں ادا کرتے ہوئے اپنی انفرادیت کی لاج رکھ لی -

تجھے گھاٹا نہ ہونے دیں گے کاروبارِ الفت میں
ہم اپنے سر ترا اے دوست ہر نقصان لیتے ہیں

یا فانی بدایونی کا مطلع ہے :-

لوئے خزاں سے مست ہیں یاد نہیں بہار کیا
ہم تو چمن پرست ہیں پھول کہاں کے خار کیا

جگر مراد آبادی نے اسی مضمون کو اپنے لب و لہجہ میں سمویا تو اس میں قیامت کے تاثر کی ایک برقی لہر دوڑ گئی -

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

یا جلیل مانک پوری کے اس شعر کے مضمون کو :-

ہوئی پوری تو آرزو نہ رہی — جو نہ پوری ہو آرزو ہے وہی

جگرؔ نے زیادہ زوردار شاعرانہ لب و لہجہ میں ادا کرتے ہوئے کہا :-

سب جسے کہتے ہیں ارمانوں کا پورا ہونا!
میرے نزدیک یہی موت ہے ارمانوں کی

یا غالبؔ کا شعر ہے :-

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

اور جوشؔ ملسیانی کہتے ہیں :-

سب تمنائیں ہماری مر چکیں
ایک مرنے کی تمنا رہ گئی

مضمون ایک ہے لیکن جوشؔ کے شعر میں "تمنائیں مر چکیں" اور "مرنے کی تمنا" کے ٹکڑوں نے لب و لہجہ کے اعتبار سے دونوں اشعار میں نمایاں فرق پیدا کر دیا۔

یا غالبؔ کا شعر ہے :-

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں

جس کا مزہ اس کی تشبیہہ میں ہے۔ جوئے خوں کے رنگ

اور شمع کے شعلے کے رنگ کی مشابہت ظاہر ہے لیکن محروم نے اس مضمون کو اپناتے ہوئے آنسو کو ستارے سے تشبیہ دے کر اس میں زیادہ وقعیت پیدا کر دی۔

روشن ہوئی ان سے شامِ فرقت
محروم یہ اشک ہیں کہ تارے

غالب ہی کا شعر ہے :-

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفان نکلا

نوح ناروی نے اس کا سلیس ترجمہ کر دیا لیکن لب و لہجہ کی سلاست ہی سے ان کے شعر میں ایک بات پیدا ہو گئی۔

جنہیں اے نوح ضبطِ غم نے دل میں روک رکھا تھا
وہ اشک آنکھوں سے اب طوفان بن بن کر نکلتے ہیں

مضطر خیر آبادی کا نہایت خوب شعر ہے :-

مصیبت اور لمبی زندگانی
بزرگوں کی دعا نے مار ڈالا

حفیظ جالندھری نے اس مضمون کو ذاتی شکل دے کر اس تاثر کو اور گہرا کر دیا اور خوب سے خوب تر شعر کہہ دیا۔

مرے بزرگ کہہ گئے عمرت دراز باد
میری شرارتوں کی سزا دے گئے مجھے

یاسؔ یگانہ کا شعر ہے :۔

جیسے دوزخ کی ہوا کھا کے ابھی آیا ہے
کس قدر واعظِ مکّار ڈراتا ہے مجھے

جس کے لب و لہجہ میں یاسؔ کا مخصوص غیظ و غضب پورے مردانہ پن کے ساتھ موجود ہے لیکن سرشار سیلانی نے اس مضمون کو اپنے اسلوب میں پیش کرتے ہوئے غیظ و غضب کو طنز اور شوخی میں تبدیل کر دیا۔

کچھ اس انداز سے تشریح فرماتے ہیں دوزخ کی
کہ جیسے حضرتِ واعظ وہیں کے رہنے والے ہیں

علّامہ اقبالؔ کا شعر ہے :۔

غرورِ زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو
کہ بندگانِ خدا پر زباں دراز کرے

عدمؔ نے اپنے تند و تیز لب و لہجہ میں شعر کے مضمون کا اس بے تکلفانہ پیرایے میں اظہار کر دیا۔

میں نمازی نہیں کہ تیری طرح
دوسروں پر زباں دراز کروں

اسی طرح اختر شیرانی کا مطلع ہے :-

بجا کہ ہے پاس حشر ہم کو مگر ہے پاس شباب پہلے
حساب ہوتا ہے گا یارب ہمیں منگا دے شراب پہلے

اپنے لب و لہجہ میں ادا کرتے ہوئے عدم نے اس خیال میں زیادہ رندانہ سرمستی پیدا کر دی ۔

طلوع حشر ہے یارب جلد بازی کیا
شراب پی لیں ذرا ہم حساب دیتے ہیں

یا فانی بدایونی کا ایک شعر ہے :-

غلط انداز نگاہوں کو سنبھال
میری گستاخ نگاہی کو نہ پوچھ

جس کے مضمون کو اپناتے ہوئے ساحر لدھیانوی نے فانی کے اسلوب کی متانت کو شوخی میں بدل دیا ۔

پھر نہ کیجے مری گستاخ نگاہی کا گلہ
دیکھئے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو

اب ان مثالوں کے برعکس مرزا غالب اور اکبر الہ آبادی کے چند ہم معنی اشعار دیکھئے ۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

(غالب)

کوئی گناہ ہو مدِ نظر معاذ اللہ
شراب پیتا ہوں میں بس سرور ہی کیلئے

(اکبر)

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

(غالبؔ)

تصدیق ہوئی دیکھ کے وہ قامتِ زیبا
سُنتا تھا کہ فتنے ہیں قیامت کے سوا بھی

(اکبرؔ)

جان دی دی ہوئی اُنہیں کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

(غالبؔ)

انہیں نے عطا کی تھی جانِ حزیں
ہوا خوب انہیں پہ فدا ہو گئی

(اکبرؔ)

مرقدِ عاشق سے جو اُگتی ہے جو کوسوں تک حنا
کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

(غالبؔ)

شوقِ پابوسیٔ جاناں مجھے باقی ہے ہنوز
گھاس اگتی ہے جو تربت پہ جدا ہوتی ہے

(اکبرؔ)

خیال اور مضمون کی ہم رنگی کے باوجود اکبرؔ کے اشعار میں وہ عظمت اور برجستگی نہیں جو غالبؔ کے شعروں میں ہے۔ بلکہ ان میں آورد اور ہلکا پن ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اکبرؔ اپنے شعروں کو غالبؔ ایسا یا غالبؔ سے بہتر لب و لہجہ نہیں دے سکے۔ اکبرؔ بہت اہم اور بہت بڑے شاعر سہی لیکن خالص تغزّل کے شاعر نہیں تھے۔ ان کا میدان دوسرا تھا۔ ان کا مخصوص لب و لہجہ غزل کے اس لب ولہجہ کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی مضمون بنیادی طور پر خواہ کسی شاعر کے ذہن کی پیداوار ہو جس شاعر نے بھی اسے سلیقے اور نفاست سے ادا کر دیا وہ اسی کی ملکیت ہو جاتا ہے اس میں تقدیم و تاخیر کی بحث لا حاصل ہے اور یہ سلیقہ اور نفاست محض خوش اسلوبی کی دین ہے لیکن اپنی تن آسانی اور سہل پسندی کی وجہ سے بعض اوقات اچھے اچھے شاعر

کسی تردّد اور تکلف کے بغیر دوسروں کے اشعار اپنا لیتے ہیں اور اپناتے وقت اپنے لب و لہجہ کا کوئی امتیازی رنگ بھی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

جیسے داغ دہلوی کا مطلع ہے :-

کیا کہیئے کس طرح سے جوانی گزر گئی
بدنام کرنے آئی تھی بدنام کر گئی

حفیظ جالندھری نے اسلوب میں ذرا سی ترمیم نہیں کی محض ردیف میں معمولی تبدیلی کے بعد اس مطلع کو اپنا مطلع بنالیا۔

دو روز میں شباب کا عالم گزر گیا
بدنام کرنے آیا تھا بدنام کر گیا

حالی کا شعر ہے :-

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

جوش ملیح آبادی نے حالی کی بجائے اسے اپنی ذات پر منطبق کرتے ہوئے صرف "لوگوں" کی وضاحت کرنے کی زحمت کی۔

بہت اچھی خوش ہوا اے ہم نشیں! کل جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں
مومن کا مشہور شعر ہے :۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

عدم نے اسی بحر میں دوسرے اور نسبتاً کمزور لفظوں میں ہو بہو یہی بات کہہ دی۔

جب بھی ہوتے ہیں ہم عدم "تنہا"
یار سے ہم کنار ہوتے ہیں

عدم کا شعر ہے :۔

فقط زخمِ نظارہ حصہ مرا
بہاریں تری آشیانے ترے

جگن ناتھ آزاد نے "آشیانے" کی جگہ صرف "گلشن" کہنے کا تکلف کیا اور شعر اپنا لیا۔

گلشن بھی ترا اور بہاریں بھی تری ہیں
آزاد کا حصہ ہے فقط زخمِ نظارہ

حفیظ جالندھری کا شعر ہے :۔

خدا لگتی کہو اے ذیر والو!
تمہارے ساتھ میں کیسا رہا ہوں

شعر کی لطافت "خدا لگتی" میں مضمر ہے لیکن جگن ناتھ آزاد نے اسے حسب ضرورت اور حسب مذہب بناتے ہوئے اس لطافت کا خون کر ڈالا

حرم والو! پرانے دوستو! ایمان سے کہنا
بسر کی ہے تمہارے ساتھ کیسے زندگی میں نے

اختر شیرانی کا شعر ہے:-

نہ ہوئی برق چمک کر بھی تبسم کا جواب
پھول کھل کر بھی حریفِ رخِ جاناں نہ ہوا

جگن ناتھ آزاد نے یہاں بھی "برق" کی بجائے "مے" کا سہارا لیتے ہوئے پورے کا پورا شعر جوں کا توں اپنا لیا۔

یہ مے چھلک کے بھی اس حسن کو پہنچ نہ سکی
یہ پھول کھل کے بھی اس کا شباب ہو نہ سکا

احسان دانش کا شعر ہے:-

زمیں پہ کلیاں حسیں و رنگیں فلک پہ تارے جمیل و روشن
مگر حقیقت میں آدمی کا نہ یہ ٹھکانا نہ وہ ٹھکانا

جگن ناتھ آزاد نے اس مضمون کو بھی اس انداز سے اپنے یہاں اس طرح منتقل کر دیا۔

یہ ہیں پھول یہ ستارے مگر اے نگاہ معنی
نہ ہے یہ ترا نشیمن نہ ہے وہ ترا ٹھکانا

گوپال متل کا ایک شعر ہے :-

مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آ رہی ہے تری سادگی پر

جو بہت حد تک مضطر خیر آبادی کے اسی شعر کے خاندان سے متعلق ہے :-

مصیبت اور لمبی زندگانی
بزرگوں کی دعا نے مار ڈالا

سادگی اور بے تکلفی کی وجہ سے گوپال متل کے اس بیحد اثر انگیز شعر کو منظور احمد منظور نے جب اپنے الفاظ میں منتقل کرنا چاہا تو تاثر کی چنگاری سرد ہو گئی۔

مجھ کو اس حال میں جینے کی دعا دیتے ہیں
ان بزرگوں کی دعاؤں پہ ہنسی آتی ہے

لیکن جوش ملسیانی نے اس مضمون میں زیادہ شوکت اور زور پیدا کرتے ہوئے شعر کہہ دیا۔

دشمن ہی نہیں ہیں انہیں قاتل بھی کہوں گا!
ہیں جن کی زباں پر مرے جینے کی دعائیں

قتیل شفائی کا شعر ہے :-

جن کو پینے کا سلیقہ ہے وہ پیاسے ہیں قتیل
جتنے کم ظرف تھے اس دور میں میخوار بنے

صرف بحر اور ترتیب بدل کر گوپال متل نے اسے یوں اپنا لیا :-

تعجب ہے کہ پینے کا سلیقہ تک نہیں جن کو
انہیں کا رخ فروغِ بادہ سے گلنار ہے ساقی

عدم کا شعر ہے :-

چل اے غمِ دوراں درِ مے خانہ ہے نزدیک
آرام سے بیٹھیں گے ذرا بات کریں گے

قتیل شفائی نے یہی بات ہلکے اور کمزور لفظوں میں

کہہ دی :-

میخانہ بہت دور نہیں دیر و حرم سے
چل اے غمِ دوراں کوئی دم ساتھ رہے گا

عدم ہی کا ایک اور شعر ہے :-

گُلوں کو کھل کے مرجھانا پڑا ہے
تبسم کی سزا کتنی کڑی ہے

منوہر لال شارب نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اس ایک شعر سے اپنے دو شعر تراش لیئے :-

کلی گُل بن کے پژمردہ پڑی ہے
تبسّم کی سزا کتنی کڑی ہے

~~~~~~~~~~

ذرا سی رونقِ گلشن کی خاطر!
گُلوں کو کھل کے مرجھانا پڑا ہے

اقبال کا شعر ہے :-

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

ساحر ہوشیار پوری نے یہی مضمون اپنے شعر میں منتقل
~~~~~~~~~~

کہنا چاہا تو اقبال کے شعر کا محض منظوم خلاصہ بیان کر دیا۔

ایسی محفل میں آ گیا ہوں جہاں
بولنے کو زباں ترستی ہے

جگر مراد آبادی کی غزل کا مطلع ہے:۔

اب اُن کا کیا بھروسہ وہ آئیں یا نہ آئیں
آ اے غمِ محبت تجھ کو گلے لگائیں!

"گلے لگائیں" کے الفاظ اس شعر کی جان ہیں۔ لیکن ساغر نظامی نے اسی مضمون کو اپناتے ہوئے یہ کہہ کر اُسے بے جان کر دیا۔

کب تک بلائے جائیں انہیں بار بار ہم
آ اے غمِ فراق کریں تجھ کو پیار ہم

لب و لہجہ کے سلسلہ میں اسرار الحق مجاز کا ایک لطیفہ بڑا فکر انگیز ہے۔ مشاعرے سے پہلے کھانے کی دعوت تھی۔ زیادہ تر شاعر کھانے سے فارغ ہو کر مشاعرے کے پنڈال میں پہنچ چکے تھے۔ لیکن مجاز اور جذبی ابھی مصروفِ خورد و نوش تھے۔ منتظمین میں سے چند لوگوں نے جذبی کے پاس آ کر درخواست کی کہ حاضرینِ مشاعرہ نہایت

بے چینی سے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ جذبی نے کہا۔
"بھیا ابھی چلتا ہوں ذرا سا رائتہ کھا لوں"
اور مجاز اتنی سی بات سنتے ہی ایک دم سنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔ "جذبی! رائتے کے مضمون کو اقبال اپنے ہاں نظم کرتا تو کچھ ایسے کرتا :۔

حیف شاہین رائتہ پینے لگا

اور اختر شیرانی کا مصرع ہوتا :۔

رائتہ جو رُخِ سلمٰی پہ بکھر جاتا ہے

اور جوش یوں کہتے :۔

رائتہ کھا کر وہ شاہِ کج کلاہاں آ گیا

اور فراق یہ انداز اختیار کرتے :۔

ٹپک رہا ہے دھندلکوں سے رائتہ کم کم

اور فیض احمد فیض لکھتے :۔

تیری انگشتِ حنائی میں اگر رائتہ آئے
ان گنت ذائقے یلغار کریں مثلِ رقیب

اور میں خود یوں نظم کرتا :۔

بنتِ شب، دلیگِ جنوں رائتے کی جائی ہو
میری مغموم جوانی کی توانائی ہو!
اور تمہیں تو یہی کہنا چاہیئے تھا:۔
ابھی چلتا ہوں ذرا رائتہ کھالوں تو چلوں

~~~~~~~~~~~~

اس لطیفے میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ لب و لہجہ کا انحصار کسی ایک لفظ کے مخصوص استعمال پر ہوتا ہے۔

آخر میں، اس سلسلہ میں یہ کہنا غیر ضروری نہ ہوگا کہ سرقہ یا توارد اصل میں ایک ایسا حمام ہے جس میں کم و بیش ہر شاعر ننگا ہے اس لئے اسے سرقہ قرار دیا جائے یا توارد، متاثر ہونا کہا جائے یا استفادہ کرنا۔ پرائے تفکر یا تاثر کی شراب کو اپنے الفاظ و بیان کے آبگینے میں اتارنے کی کوششِ شعوری یا ارادی سمجھی جائے یا محض اتفاق پر محمول کی جائے۔ اسے معیوب ہرگز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اگر یہ معیوب ہے تو ان شاعروں کے لئے جن کی قوتِ اظہار کمزور ہے اور جو زبان و بیان کی نزاکتوں کا بھرپور شعور نہیں رکھتے۔

یہاں تو میں نے اردو شاعروں میں محض غزل گو شاعروں
~~~~~~~~~~~~

ہی کی مثالیں پیش کی ہیں۔ لیکن اگر وسعتِ نظر سے کام لے کر دیکھا جائے تو دنیا بھر کی شاعری میں ایسی ایک آدھ نہیں کئی مثالیں مل سکتی ہیں جو ایک زبان یا ایک ملک ہی کے نہیں مختلف ادوار اور مختلف ماحول میں پلے ہوئے شعرا کو بھی نقّال اور سارق بنانے کے لئے کافی ہیں۔